

26

قرآن کی معرفت

آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ

شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)

www.shahidmutairi.com

قرآن کی معرفت

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

مترجم:
حجۃ الاسلام مولانا روشن علی

شہید مطہری فاونڈیشن لاہور پاکستان

نام کتاب: قرآن کی معرفت
تصنیف: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
کمپوزنگ: انس کمیونیکیشن 03004271066
مترجم: حجۃ الاسلام مولانا روشن علی
سال اشاعت 2014
ناشر: شہید مرتضیٰ مطہری فاونڈیشن

ملنے کا پتہ
معراج کمپنی
بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد
0333-5234311

A

پاک ہے وہ ذات جس نے انسان کو پیدا کیا اور عقل دے کر تسخیر کے لئے دنیا اس کے آگے رکھ دی۔ لاکھ شکر ہے اس ذات کا جس نے انسان کی فلاح کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں مبعوث کیا۔

استاد شہید مطہری کی خدمات کے اعتراف اور نوجوان نسل کو ان کے علمی مقام و مرتبہ سے روشناس کرانے کے لیے شہید مرتضیٰ مطہری فاونڈیشن کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس ادارہ کے پلیٹ فارم سے استاد شہید کے افکار اور کو عوام میں روشناس کرایا جائے۔ استاد شہید کی کتب کی اشاعت کے لئے ایک جماعت مصروف کار ہے جو مقامی اور بین الاقوامی اداروں سے استاد شہید کی تصانیف حاصل کر کے شائع کرنے کی کوشش میں مذکورہ کتاب اس کے قبل '' سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل''، ایران سے شائع کی گئی تھی۔

قرآن کا معرفت کے بارے میں جس قدر جاننے کی آج ضرورت ہے شاید اس سے قبل اتنی ضرورت کبھی نہ تھی، آج ہمارا معاشرہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کی اصلاح کے لئے قرآن کی معرفت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا اسی طرح اس موضوع کو اس طرح سے بیان کرنا استاد شہید کا ہی کام ہے۔

امید ہے پاکستان میں بسنے والے ''الٰہی معارف'' کے تشنہ لب جوانوں کی پیاس بجھانے اور انہیں معارف کے اس عظیم ذخیرے سے آشنا کرنے کے لیے یہ مختصر کاوش مفید ثابت ہوگی۔



فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن کی شناخت

ویسے تو ہر عالم کے لئے ایک عالم ہونے کی حیثیت سے اور ہر مومن کے لئے ایک مومن ہونے کے ناطے قرآن کی شناخت واجب وضروری ہے۔

لیکن ایک انسان شناس اور معاشرہ شناس عالم کے لئے قرآن کی شناخت اس لئے بہت ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے کی سرنوشت بلکہ بشریت کی تکوینِ سرنوشت میں قرآن نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ تاریخ کا اگر سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بشری معاشرہ تو خیر! ہر انسان کی زندگی پر عملی طور سے قرآن نے جو اثر چھوڑا ہے کسی کتاب نے بھی اتنا متاثر نہیں کیا ہے۔ [۱]

اسی لئے قرآن خود بخود جامعہ شناسی کی بحث میں داخل ہو کر اس علم کے تحقیقاتی موضوعات کا جزو بن جاتا ہے۔ میری اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصے میں دنیاوی تاریخ کی تحقیق عموماً اور اسلامی معاشرے کی شناخت خصوصاً قرآن کی

---

[۱] البتہ یہ بات کہ قرآن نے کس قسم کا اثر چھوڑا ہے، آیا قرآن نے تاریخ کے رخ کو بشریت کے رفاہ وسعادت کی طرف موڑا ہے یا نقص وانحطاط کی طرف موڑا ہے؟ اور آیا اس کتاب نے تاریخ میں ایک نئی حرکت پیدا کر دی اور بشری معاشرے کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا، یا اس کے برعکس کام کیا؟ یہ ایسی باتیں ہیں جو فعلاً ہماری بحث کی حدود سے خارج ہیں

شناخت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔قرآن کی شناخت ایک مسلمان مومن کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان کے دین وایمان کی بنیاد، اصلی منبع اور مرکزی فکر کے اعتبار سے مومن کی زندگی کو''حرارت''، یعنی حرمت اوراس کو روح بخشنے والا صرف قرآن ہے۔

قرآن دیگر مذہبی کتابوں کی طرح نہیں ہے جن میں خدا خلقت، تکوین کے سلسلے کے مسائل اور زیادہ سے زیادہ کچھ اخلاقی نصیحتیں ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے اور ان کتابوں کے ماننے والے دیگر منابع سے دستور وافکار لینے پر مجبور ہیں۔

بلکہ ہر انسان کے لئے ایک ''باایمان'' موجود ہونے کے ناطے جن عقائد وافکار کا جاننا ضروری ہے اور جن اصولِ تربیت واخلاق اور اجتماعی وخانوادگی نظام کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے۔صرف تفسیر وتوضیح وتشریح کو اور کبھی کبھی اجتہاد........یعنی تطبیقِ اصول بر فروع ....کو سنت کے ذمہ یا مجتہد کی ذمہ داری کے حوالے کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی منبع سے استفادہ شناخت قرآن سے قبل غیر ممکن ہے۔قرآن تمام دیگر منابع کا معیار و پیمانہ ہے۔حدیث وسنت کو بھی قرآنی معیار پر پرکھنا ضروری ہے کیونکہ قرآن کے مطابق ہی جو حدیثیں یا سنن ہیں ہم صرف انہی کو قبول کریں گے۔

قرآن مجید کے بعد احادیث کے سلسلے میں سب سے معتبر اور مقدس ترین مآخذ ہمارے یہاں کتب اربعہ ہیں........کافی من لایحضر الفقیہ، تہذیب، استبصار........ اور خطبوں میں نہج البلاغہ اور دعاؤں میں صحیفہ سجادیہ ہے لیکن یہ سب قرآن ہی پر موقوف ہیں لیکن قرآن کے برابر قطعی الصدور نہیں ہیں۔

کتاب کافی اسی قدر معتبر ہے کہ جس قدر قرآن کے مطابق ہے اور تعلیماتِ قرآن کے موافق ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آئمہ معصومین f کا فرمان ہے: ''ہماری حدیثوں کو قرآن پر پیش کر کے دیکھو اگر وہ قرآن کے مطابق نہیں ہیں تو سمجھ لو کہ جعلی و من گھڑت ہیں اور لوگوں نے ہماری طرف غلط نسبت دی ہے کیونکہ ہم قرآن کی موافقت کے

بغیر کچھ کہتے ہی نہیں ہیں''۔

شناختِ قرآن کی قسمیں

جب یہ بات طے ہوگئی کہ ''شناخت قرآن'' کی ضرورت ہےتو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کتاب کی شناخت کیونکر ممکن ہوسکتی ہے؟ ہر کتاب کے مطالعہ اوراس کی تحقیق کے لئے بطور کلی تین قسم کی معلومات کا فراہم ہونا ضروری ہے۔

اول:۔سند یا انتساب

اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کتاب کی نسبت جس مصنف یا مؤلف کی طرف دی گئی ہے وہ کس حد تک یقینی ہے؟ مثلاً فرض کیجئے ہم دیوانِ حافظ یا دیوانِ خیام یا دیوانِ غالب کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ہم معلوم کریں آیا جتنے بھی حافظ کی طرف منسوب دواوین ہیں وہ سب حافظ ہی کے ہیں یا ان میں سے کچھ تو واقعاً حافظ کے ہیں باقی سب حافظ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں حافظ کے نہیں ہیں۔اسی طرح خیام و غالب کے دیوانوں کو دیکھنا پڑے گا۔اور یہیں سے نسخوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ان میں سب سے قدیم اورسب سے زیادہ معتبر نسخہ کونسا ہے؟اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ دنیا کی ہر کتاب کے لئے یہی بات ہوگی۔

حافظ کا وہ دیوان جسے مرحوم قزوینی نے شائع کیا ہے اور جس کی صحت میں معتبر ترین نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے، وہ حافظ کے ان عام دیوانوں سے جو بمبئی[1] یا ایران

---

[1] بمبئی کا نیا نام ممبئی رکھا گیا ہے(مصحح)

میں چھپے ہیں اور جن کے نسخے حافظ کے خاندان میں موجود ہیں ان سے کافی مختلف ہے۔ حافظ کے وہ نسخے جو ۳۰۰، ۴۰۰ سال پہلے چھپے ہیں آج کے نسخوں کے مقابلے میں جنہیں ماہرین معتبر سمجھتے ہیں تقریباً حجم میں دوگنے ہیں حالانکہ ماہرین نے جن اشعار کو جعلی اور حافظ کی طرف ان کی نسبت کو غلط بتایا ہے ان میں کبھی ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو حافظ کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اسی طرح اگر خیام کی طرف منسوب رباعیات پر نظر ڈالئے تو تقریباً دوسو رباعیاں ایسی ہیں جو سب ایک ہی سطح کی ہیں اور اگر ان میں کوئی اختلاف ہے بھی تو صرف اسی قدر جو دیگر شعرا کے یہاں ہوتا ہے حالانکہ اگر آپ تاریخی لحاظ سے ماضی کی طرف دیکھتے چلے جائیں اور خیام سے قریب تر جو زمانہ ہے تو اس میں آپ کو یقینی طور سے یہ ملے گا کہ جو تعداد خیام کی طرف قطعی وحتمی طور سے منسوب ہے وہ شاید بیس سے بھی کم ہو۔ باقی کی صحت مشکوک ہے یا پھر وہ قطعاً دوسروں سے متعلق ہے۔

اس لئے کسی بھی کتاب کی شناخت کے لئے سب سے پہلا مرحلہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے بااعتبار سند اس کا قائل یا اس کا لانے والا کس قدر معتبر ہے؟ آیا سب ہی کی سند معتبر ودرست ہے یا اس کا کچھ حصہ تو معتبر ہے اور کچھ غیر معتبر، ایسی صورت میں کتنے فیصد مطالب کی تائید ہم انتساب کے اعتبار سے کر سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ ہم کس دلیل کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ حصہ معتبر اور کچھ قطعاً غیر معتبر اور کچھ مشکوک ہے؟

اس قسم کی شناخت کا وجود قرآن میں نہیں ہے اور صرف قرآن ہی دنیا کی وہ واحد قدیم ترین کتاب ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی اب تک بغیر کسی شک وشبہ کے باقی ہے۔ اس کے اندر ایسے مسائل کہ ''فلاں سورہ مشکوک ہے، فلاں آیت فلاں نسخہ میں ہے، فلاں میں نہیں ہے'' کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ان تمام آیات کے لانے والے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ ان تمام آیتوں کو بعنوان معجزہ اور کلام الٰہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی لائے نہ کوئی شخص مدعی ہے اور نہ کسی نے احتمال دیا ہے کہ قرآن

کا کوئی دوسرا نسخہ موجود تھا یا موجود ہے۔

بلکہ اب تک دنیا میں کوئی ایسا مستشرق نہیں پیدا ہوا جو قرآن شناسی کے سلسلے میں کہے کہ قرآن کے قدیم ترین نسخوں کو تلاش کر کے دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا چیزیں ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ تورات، انجیل، اوستا، شاہنامہ، گلستان اور دوسری کتابوں کے لئے یہ احتمال ہے مگر قرآن کے بارے میں ایسا کوئی احتمال موجود نہیں ہے۔

قرآن ایک مقدس ترین کتاب ہونے کے باوجود اور اس کے باوجود کہ قرآن کے ماننے والے بھی اسی نظر سے اسے دیکھتے ہیں، پیغمبر اسلام b کے دعوے پر برہان صادق اور دلیل محکم بھی ہے اور رسول اسلام b کا سب سے بڑا معجزہ بھی یہی ہے۔ ایک خصوصیت قرآن کی یہ بھی ہے کہ وہ تورات کی طرح ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوا کہ بعد میں یہ اعتراض اٹھ سکے گا کہ اس کا اصلی نسخہ کون سا ہے بلکہ قرآن کی آیتیں ۲۳ سال تک وقتاً فوقتاً ضرورت کی بناء پر بتدریج نازل ہوتی رہیں اور پہلے ہی دن سے مسلمانوں نے قرآن کی آیتوں کو حفظ وضبط کرنا شروع کر دیا اور جس طرح ایک تشنہ لب ٹھنڈے و شیریں پانی کا طلبگار رہتا ہے، مسلمانوں کی حالت قرآنی آیات کے بارے میں اس سے کم ہرگز نہیں تھی۔

اس کے علاوہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے پاس کوئی دوسری کتاب بھی نہیں کہ اس کے حفظ اور اس کے ضبط پر مسلمان مجبور ہوں، چونکہ نوعاً مسلمان لکھے پڑھے نہیں تھے اور بالکل خالی الذہن تھے اور بے پناہ حافظہ کے مالک تھے اور قرآن کی لطافت و بلاغت ان کے مزاج کے موافق تھی، اس لئے آیاتِ قرآنی ان کے سینوں میں اس طرح پیوست ہو جاتی تھیں جس طرح پتھر پر نقش۔

اور چونکہ یہ لوگ قرآن کو خدا کا کلام سمجھتے تھے اس لئے اس کو مقدس سمجھتے تھے اور ایک کلمہ یا ایک حرف میں ردوبدل کے قائل نہ تھے، نہ آگے پیچھے کرنے کو جائز جانتے تھے اور مسلسل ان کی کوشش یہی رہتی تھی کہ خدا سے قربت کا ذریعہ صرف تلاوتِ قرآن ہے۔ اس

لئے بیشتر اوقات مشغول تلاوت رہا کرتے تھے۔ یہی اسباب تھے کہ قرآن میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوسکی۔

اس کے علاوہ نزول قرآن کے پہلے ہی دن سے رسول اکرم b نے کچھ مخصوص افراد کو قرآن کی کتابت کے لئے متعین کر دیا تھا جو ہر نازل ہونے والی آیت کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ان کو ''کاتبِ وحی'' کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے اسبابِ حفاظت کسی بھی قدیمی کتاب کو حاصل نہیں ہو سکے اور انہیں اسباب کی بناء پر وہ تمام اقسام کی تعریف سے محفوظ ومصوٴن رہا۔

منجملہ دیگر اسبابِ قبولیت کے لوگوں میں قرآن کے مقبول ہونے کا ایک اہم سبب غیر معمولی فصاحت و بلاغت کا حامل ہونا تھا۔ قرآن کی ادبیت لوگوں کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور لوگ بڑی جلدی سے اسے حفظ کر لیتے تھے۔

برخلاف دیگر ادبی کتابوں کے مثلاً دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم وغیرہ کو جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اس میں اپنی مرضی سے اضافہ وکمی کر دیتے ہیں تا کہ اپنی نظر میں اسے کامل تر کر دیں لیکن قرآن کے سلسلے میں کسی کی یہ ہمت نہیں تھی کہ ذرا سی ترمیم و تنسیخ کر سکے کیونکہ اگر کوئی سوچتا بھی ہوگا تو قرآن کی یہ آیت:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ [1]

''اگر اس نے گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن سے کاٹ ڈالتے''۔

اور اس کے علاوہ دوسری آیتیں خدا پر جھوٹ باندھنے کے عظیم گناہ کو آشکار کر دیتی ہیں اور اس سے ہر شخص کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی تھی اور وہ اس کے خیال سے بھی دوری اختیار کرتا ہے۔ اس طرح اس آسمانی کتاب میں تحریف ہونے سے پہلے پہلے اس کی

---

[1] سورہ الحاقۃ آیات ۴۴ تا ۴۶

آیتیں متواتر ہوگئیں اور اس منزل پر پہنچ گئیں کہ ان کے انکار یا ایک حرف کی بھی کمی یا زیادتی کا امکان ہی ختم ہوگیا۔لہٰذا قرآن کے بارے میں اس قسم کی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے اور ہر قرآن شناس قرآن کے بارے میں اس بحث کو لغو سمجھتا ہے۔

ہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ جب اسلامی حکومت چڑھتے ہوئے سورج کی طرح تمام دنیا کو اپنے زیرِ نگیں کر رہی تھی اور تمام دنیا کی نظریں قرآن کی طرف لگی تھیں اور مدینہ جو حافظانِ قرآن وصحابہ کا مرکز تھا........ سے عام مسلمانوں کی دوری تھی اس وقت یہ خطرہ بہت زیادہ تھا کہ رفتہ رفتہ کم از کم دور افتادہ مقامات پر عمداً یا سہواً یا اشتباہاً قرآن کے نسخوں میں کچھ کمی وبیشی یا ردوبدل ہو جائے لیکن مسلمانوں کی ذہانت اور موقع شناسی نے قرآن کو اس سے بچا لیا اور مسلمانوں نے تو پہلی صدی ہی کے پانچ دہائیوں تک اس سر پر منڈلانے والے خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔اس لئے حافظانِ قرآن اور صحابہ کرام کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دور افتادہ مسلمانوں کے لئے مدینہ سے تصدیق شدہ قرآن کے نسخے بھیج دیئے گئے تاکہ اس میں کوئی کمی یا زیادتی جان بوجھ کر یا بھولے سے بھی نہ ہونے پائے اور اس طرح قرآن کو ہمیشہ کے لئے تحریف سے بچا لیا گیا اور خصوصاً یہودیوں کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ کر لیا گیا جن کا مشغلہ ہی یہی تھا۔

دوم: شناخت تحلیلی

شناخت تحلیلی سے مراد یہ ہے کہ اس بات کو طے کیا جائے کہ کتاب کن مطالب پر مشتمل ہے؟ کس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے؟ کائنات کے بارے میں اس کتاب کا کیا نظریہ ہے؟ انسان کے بارے میں اس کا کیا تصور ہے؟ معاشرے کے بارے میں کونسا زاویہ نگاہ ہے؟ کتاب کے مطالب کو کس انداز سے پیش کیا گیا ہے؟ مسائل کو حل کرنے کے کیا انداز ہیں؟ اس کتاب کا نقطہ نظر فلسفیانہ ہے یا آج کی اصطلاح میں عالمانہ ہے؟ یہ کتاب واقعات کو ایک عارف کی نگاہ سے دیکھتی ہے یا اس کا خود اپنا ایک مخصوص انداز ہے؟ اس کے فوراً بعد دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کتاب بشریت کے لئے کوئی

پیغام یا رہنمائی کا کام انجام دیتی ہے یا نہیں؟ اب اگر جواب مثبت ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیغام کیا ہے؟

مختصر یہ کہ پہلی قسم کے سوالات اس بات سے مربوط ہیں کہ کائنات، انسان، حیوان، زندگی اور موت وغیرہ کے بارے میں کتاب کا کیا نظریہ ہے؟ اس بات کو جامع لفظوں میں اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ کتاب ''جہاں بینی'' سے مربوط ہے یا بقول اہلِ فلسفہ یہ کتاب حکمت نظری سے متعلق ہے۔ (حکمت عملی سے نہیں)

لیکن دوسری قسم کے سوالات کا مقصد یہ ہے کہ کتاب انسانی مستقبل کے لئے کیا نظریہ پیش کرتی ہے۔ انسان اور انسانی معاشرے کو کس نمونے کی بنیاد پر تربیت کرنی چاہیے؟ اسی کو ہم ''کتاب کا پیغام'' کہتے ہیں۔

بہرحال اس قسم کی شناخت مشتملاتِ کتاب سے مربوط ہے اور ہر کتاب کے بارے میں اس نظر سے بحث کی جا سکتی ہے چاہے وہ بوعلی سینا کی کتابِ شفاء ہو یا سعدی کی گلستان! یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کتاب کے اندر نہ تو کوئی نظریہ پیش کیا گیا ہو اور نہ کوئی پیغام! یا اس میں صرف نظریات سے بحث ہو پیغام کا نام و نشان بھی نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب دونوں باتوں کی حامل ہو۔

قرآن کی شناختِ تحلیلی کے سلسلے میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن مجموعی طور سے کن مسائل پر مشتمل ہے؟ اور قرآن نے ان مسائل کو کس طرح پیش کیا ہے؟ مختلف چیزوں کے بارے میں قرآن کے احتجاجات، استدلالات کس قسم کے ہیں؟ آیا چونکہ قرآن ایمان کا محافظ و نگہبان ہے اور اس کا پیغام ایک ایمانی پیغام ہے وہ عقل کو ایک رقیب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ عقل کے تمام تہاجم کی روک تھام کرے اور رقیب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دے یا اس کے برعکس وہ عقل کو ایک مددگار اور دفاع کرنے والے کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی طاقت سے مدد حاصل کرتا ہے۔ یہ سوالات اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہیں جو قرآن کی شناخت تحلیلی کے سلسلے میں پیش آتے ہیں

جوہمیں قرآن کی ماہیت سے آشنا کرتے ہیں۔

سوم: بنیادی شناخت

جب کسی کتاب کا استناد وانتساب صحیح طریقے سے کسی مصنف کی طرف ثابت ہو جائے اور مضامین کتاب کی باقاعدہ تحقیق ہوجائے تو پھر اس کے بعد یہ تحقیق کرنا چاہیے کہ کتاب میں درج مضامین خود مصنف کے افکار وخیالات ہیں یا مصنف نے دوسروں کے مفاہیم کو اپنے انداز کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ مثلاً دیوانِ حافظ ہی کو لے لیجئے کہ اس کی مستند تحقیق اور تحلیلی شناخت کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حافظ نے جن مطالب وافکار کو کلمات، جملوں، اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہےاوراپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے یہ سب خود حافظ کی ایجاد واختراع ہے یا صرف الفاظ،کلمات، خوبصورتی وزیبائی تو حافظ کی ہے لیکن فکرومطالب کسی ایک یا کئی ایک دوسرے افراد کی مرہون ہے۔

اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حافظ کی ہنری اصالت ثابت ہونے کے بعد

ان کی اصالت فکری بھی ثابت ہونی چاہیے۔[۱]

حافظ ہوں یا کوئی دوسرا مؤلف ......مؤلف کے افکار و خیالات کے بارے میں بنیادی مسائل کی تحقیق کا ایک طریقہ ہے اور اس قسم کی شناخت، تحلیلی شناخت پر موقوف ہوا کرتی ہے کہ پہلے تو بڑی باریک بینی کے ساتھ مؤلف کے افکار وخیالات کے بارے میں شناخت حاصل کی جائے اس کے بعد بنیادی شناخت کے بارے میں اقدام کیا جائے۔

اور اگر اس صورت کار کو اختیار نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو بہت سے ایسے علوم کے تاریخ نویسوں کا ہوتا ہے جو علوم سے نا آشنا ہونے کے باوجود علوم کی تاریخ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں بعض ان فلسفی کتابوں کے مؤلفین کا نام لیا جا سکتا ہے جو ابن سینا اور

---

[۱] ممکن ہے کہ حافظ ایک ہنرمند شخص ہوں، نہ مفکر ہوں نہ عارف اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہنرمند ہونے کے ساتھ ساتھ مفکر بھی ہوں اور عارف بھی ہوں۔ حافظ کے بارے میں جو بات طے شدہ ہے وہ یہ ہے کہ حافظ کا شمار شاعر ہونے سے پہلے علماء میں ہوتا تھا۔ وہ دوسروں کے افکار و تحریر سے بہت پہلے سے واقف تھے۔ شعراء، ادباء، مفسرین، فقہا کے افکار و کتب سے خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ خصوصاً عرفا کے کلام سے بہت زیادہ واقف تھے۔ اور یہ بات مطالعہ کی مرہون نہیں تھی بلکہ تمام یا اکثر چیزوں کو اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے حاصل کیا تھا۔ اگرچہ ہمارے زمانے میں حافظ صرف شاعر ہونے کے ناطے پہچانے جاتے ہیں۔ بحیثیت عالم ان کو کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ وہ اپنے زمانے میں ایک برجستہ عالم تھے جو کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ حافظ کے زمانے سے قریب جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں حافظ کے لئے جو القاب استعمال کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر عالم کے لئے استعمال ہوتے ہیں نہ کہ شاعر کے لئے۔ اب اس جیسے عالم کے لئے ...... جو اپنی زبان کے اصولوں سے باقاعدہ واقف تھا اور عرفان و سیر و سلوک معنوی کے بارے میں کافی سے زیادہ معلومات رکھتا تھا۔ سلوک عرفانی کی منازل کو دوسرے فارسی شاعروں کی بہ نسبت جس نے اپنے اشعار میں زیادہ استعمال کیا ہے ...... یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان افکار کے پیش کرنے میں حافظ صرف مقلد تھے یا ان خیالات کے موجد تھے؟ اسی طرح مثلاً محی الدین اندلسی جن کو اسلامی عرفان کا باوا آدم کہا جاتا ہے، حافظ ان سے متاثر تھے کہ نہیں؟ یا ابن فارض مصری جن کا زمانہ حافظ کے زمانے سے پہلے ہے اور جو عربی و عرفانی ادبیات میں وہی اہمیت رکھتے ہیں جو حافظ فارسی ادبیات میں رکھتے ہیں۔ حافظ نے ان کے افکار سے استفادہ کیا ہے یا نہیں؟ یعنی ابن فارض نے حافظ کو متاثر کیا ہے یا نہیں؟ یہ تمام چیزیں بنیادی مسائل کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کا فریضہ ہے کہ ان تمام باتوں کا مفصل جواب دیں!

ارسطو اوران کے متشابہات ومتفرقات کے بارے میں سینکڑوں صفحات سیاہ کر دیتے ہیں، حالانکہ نہ وہ ابن سینا کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ ارسطو کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں۔ ان مؤلفین کی حالت یہ ہے کہ ذراسی لفظی مشابہت مل جانے پر فوراً فیصلہ کرنے لگتے ہیں، حالانکہ مقابلہ کرنے کے لئے بڑے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اور ابن سینا و ارسطو جیسے فلسفیوں کے افکار وخیالات کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے ایک عمر کی ضرورت ہوتی ہے اوراس کے بغیر اگر کچھ لکھا جائے گا تو وہ ظن وتخمین اور اندھی تقلید کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔[۱]

قرآن کا تینوں مرحلوں میں استقلال

قرآن کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تینوں مرحلوں میں اصالت کا حامل ہے یعنی جہاں تک پہلی اصالت.... اصالت انتساب.... کا سوال ہے، وہ مُسلّم ہے یعنی قدیمی نسخوں کی تلاش وجستجو کے بغیر بلا جھجک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آج جس کتاب کو بنام قرآن پڑھا جاتا ہے یہ بعینہ وہی قرآن ہے جس کو پیغمبراسلام b نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا تھا۔

اسی طرح دوسری اصالت یعنی مطالب قرآن کا اصلی ہونا ہے، یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کوئی اقتباسی یا نقلی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے تمام مضامین ابتکاری نہیں۔

اب رہی تیسری اصالت یعنی یہ قرآن الٰہی کلام ہے۔ اس کے مطالب حضرت

---

[۱] قرآن کی تحقیق وشناخت کے لئے ضروری ہے کہ جب قرآن کا تحلیلی مطالعہ ہو جائے تو قیاس وشناختِ تاریخی کا مسئلہ اٹھایا جائے۔ یعنی قرآن کے تمام مشتملات کو ان کتابوں کے مضامین کے مقابلے میں پرکھا جائے جو اس زمانے میں تھیں خصوصاً مذہبی کتابوں کا باہم تقابل کیا جائے اور اس تقابل میں تمام شرائط وامکانات کو پیش نظر رکھا جائے مثلاً جزیرۃ العرب کا ارتباط ودیگر تمام نقاط کے ساتھ کیونکر تھا؟ اس زمانے میں مکہ میں کتنے لوگ پڑھے لکھے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ قرآن میں جو باتیں ہیں وہ دوسری کتابوں میں بھی ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہیں تو ان کی نسبت کیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ جو مطالب دیگر کتابوں سے ملتے جلتے ہیں وہ مستقل ہیں یا اقتباسی شکل کے حامل ہیں۔ یہاں تک کہ ان کتابوں کی اغلاط کی تصحیح اور ان کی تحریفات تک کو مکمل طور سے پرکھا جائے کہ یہ سب کس معیار کے ہیں؟

رسول b کے ذہن وفکر کے مخلوق نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کا کلام ہے۔آنحضرت b کی حیثیت صرف ''حامل وحی'' کی ہے،قرآن کی بنیادی تحقیق کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے جس طرح دوسری اصالت شناختِ تحلیلی کا بھی یہی نتیجہ ہے۔

لیکن چونکہ قرآن کی بنیادی تحقیق دوسری قسم کی شناخت پر موقوف ہے،اس لئے ہم اپنی بحث کا آغاز شناخت تحلیلی سے کریں گے یعنی ہم پہلے یہ تحقیق کریں گے کہ قرآن کے مضامین کیا ہیں؟ کون سے وہ مسائل ہیں جو قرآن نے پیش کئے ہیں،اور وہ کون سے مسائل ہیں جن کے بارے میں قرآن بہت زیادہ حساس ہے،کن موضوعات کو قرآن نے پیش کیا ہے اگر شناختِ تحلیلی کا مرحلہ بخوبی انجام پا گیا اور معارفِ قرآن سے کافی واقفیت حاصل کر لی تو پھر ہم اس اصالت تک پہنچیں گے جو عمدہ ترین اصالت کہی جاتی ہے یعنی ''اصالت الٰہی''اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن معجزہ ہے۔

شناختِ قرآن کی شرائط

قرآن کی شناخت کے لئے چند مقدمات کا مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔

۱۔پہلی شرط تو یہ ہے کہ عربی زبان کو بخوبی جانتا ہو کیونکہ جس طرح حافظ وسعدی کے بارے میں آدمی اس وقت معقول جانکاری نہیں حاصل کرسکتا جب تک فارسی زبان کو نہ جانتا ہو،اسی طرح عربی زبان میں لکھے ہوئے قرآن سے اس وقت تک واقفیت نہیں حاصل ہوسکتی جب تک عربی زبان نہ جانتا ہو۔

۲۔دوسری شرط تاریخ اسلام سے واقفیت کی ہے کیونکہ قرآن توارات وانجیل کی طرح کی کتاب نہیں ہے۔جو ایک ہی مرتبہ میں پیغمبر b کے واسطہ سے اس کی امت کے لئے بھیج دی گئی ہو بلکہ قرآن بعثت سے لے کر وفات تک کے ۲۳ سالہ حیاتِ پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا ہے۔اور اسی لئے آیاتِ قرآنی کے لئے شانِ نزول کا جاننا بھی ضروری ہے۔شانِ نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آیت کے معنی کو محدود کردے بلکہ اس کا مطلب مضمون آیت کو مزید واضح روشن کرنا ہے۔

۳۔تیسری شرط یہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام b کے کلام سے بھی واقفیت رکھتا ہو کیونکہ بہ نص قرآن اس کے پہلے مفسر......یعنی بیان کرنے والے......وہی ہیں، چنانچہ قرآن میں ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

اورتمہارے پاس قرآن نازل کیا ہے تا کہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم ان سے صاف صاف بیان کردو۔[۱]

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کے نفوس کو پاک کرتے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں۔[۲]

قرآن کی نظر میں خود رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس کتاب کے مبین ومفسر ہیں اور رسول اکرم b کے اقوال تفسیر قرآن میں بہت معین و مددگار ہیں اور ہم چونکہ شیعہ ہیں اور آئمہ اطہار f پر عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو چیزیں خدا نے دی تھیں، آنحضرت b نے اپنے اوصیاء کو منتقل فرما دیا ہے، اس لئے آئمہ معصومین f کی جو روایات معتبر ہیں ان کی حیثیت حدیث رسول b ہی کی طرح ہے اس لئے معصومین f کی حدیثیں بھی تفسیر میں بہت مددگار ہیں۔

ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے تو قرآن کو قرآن ہی

---

[۱] سورۃ نحل، آیت ۴۴

[۲] سورۃ الجمعہ، آیت ۲)

سمجھنے کی کوشش کی جائے کیونکہ پورا قرآن ایک عمارت کی طرح ہے۔ اگر ہم صرف ایک آیت کو قرآن سے الگ کر کے یہ کہیں کہ ہم صرف اسی آیت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو صحیح طریقہ نہیں ہے، اگر چہ اس کا بھی امکان ہے کہ ہم نے اس ایک آیت کا مطلب جو سمجھا ہے وہ درست ہو مگر یہ طریقہ بہرحال خلافِ احتیاط ہے۔ قرآن کی بعض آیتیں دوسری بعض آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں۔[1]

اور جیسا کہ بعض بزرگوں نے بھی فرمایا ہے کہ آئمہ معصومین e نے اس قسم کی تفسیر کی تائید فرمائی ہے...... یعنی قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیتوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرنا...... قرآن بیانِ مسائل کے سلسلے میں اپنا مخصوص انداز رکھتا ہے، بہت سے ایسے مقامات ہیں کہ اگر ایک آیت کو لے کر ''دوسری آیتوں کو دیکھے بغیر'' اس کے مفہوم کو دیکھا جائے اور پھر اسی قسم کی دوسری آیتوں کے پہلو میں رکھ کر اسی آیت کو دیکھا جائے تو دونوں مطلب میں بہت زیادہ فرق معلوم ہو جائے گا۔

قرآن کا اپنا خود ایک مخصوص انداز ہے، اس مفہوم کو ثابت کرنے کے لئے بطور نمونہ متشابہ و محکم آیات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ محکم و متشابہ آیات کے بارے میں ایک عوامی تصور یہ ہے کہ محکم آیات ان کو کہا جاتا ہے جن میں مطالب کو بہت واضح اور بالکل سیدھے طریقے سے بیان کیا گیا ہو۔ اور متشابہ ان آیات کو کہا جاتا ہے جن میں موضوعات کو بطور معما و پہیلی بیان کیا گیا ہو۔

اس تعریف کی بناء پر لوگوں کو یہ حق ہے کہ صرف محکم اور واضح آیتوں کے بارے میں غور کریں لیکن متشابہ آیتیں بنیادی طور سے شناخت کے قابل نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس وقت لازمی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر متشابہ آیتوں کا فلسفہ کیا ہے؟ اور قرآن نے کیوں ایسی آیتوں کو پیش کیا ہے جو شناخت کے قابل نہیں ہیں؟

اس کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ نہ تو محکم کے معنی صریح و سادہ کے ہیں اور نہ متشابہ کا

---

[1] ان القرآن یسفر بعضہ بعضاً

مطلب پہیلی و معمہ ہے بلکہ معمہ اور رمز ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی مبہم و مجمل ہوا کرتے ہیں اور ان کو ایسے کلمات سے بیان کیا جاتا ہے جس سے ڈائریکٹ معنی سمجھ میں نہیں آتے مثلاً جب فردوسی نے ناقابل برداشت زحمت کر کے شاہنامہ لکھا اور محمود غزنوی نے اس کے مقابلے میں بہت معمولی سی اجرت دینا چاہی جسے فردوسی نے قبول نہیں کیا اور شاہنامے کے آخر میں ہجو کے اشعار شامل کر لئے جس میں محمود کو بخیل اور کنجوس کہا۔ ان ہجویات میں کچھ اشعار تو صریح ہیں لیکن کچھ بطور معما کہے گئے ہیں مثلاً ایک شعر یہ ہے۔

اگر مادر شاہ بانو بُدی مرا سیم و زر تا بہ زانو بدی

یعنی اگر شاہ کی ماں شہزادی ہوتی تو شاہ مجھ کو سونے چاندی میں زانو تک غرق کر دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ شاہ کنیز زادہ ہے، اس کنیز زادہ ہونے کو کنایۃً بیان کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

شاہ محمود کشور کشائی نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

فردوسی نے یہاں پر ایک معما سے استفادہ کیا ہے پہلے آپ اسے معمے کو سمجھیں اس کے بعد شعر سمجھ میں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۴ x ۳ = ۱۲ اور ۹x۹ = ۸۱، ۸۱ اور ۱۲ کا مجموعہ ۹۳ ہوتا ہے۔ اب اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ سلطان محمود کی مٹھی اس طرح مضبوطی کے ساتھ بند ہے کہ صرف انگوٹھا کھلا ہوا ہے اور انگوٹھا و کلمہ کی انگلی باہم ۹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے بعد تینوں انگلیوں کو ملایا جائے تو ۹۳ ہو جاتا ہے۔ اس شعر سے فردوسی محمود کی ضرورت سے زیادہ بخل کی نشاندہی کرتا ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ کیا قرآن میں بھی معمے والی آیتوں کا وجود ہے؟ یہ بات قرآن کی اس آیت کے مخالف ہے جہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو واضح ہے اور سب کے سمجھنے کے لائق ہے، اس کی تمام آیتیں نور و ہدایت ہیں۔ درحقیقت مطلب یہ ہے کہ قرآن میں بیان کئے گئے بعض مسائل (خصوصاً جہاں پر امور غیب اور ماورائے طبیعت کا بیان ہے) بنیادی طور پر الفاظ کے جامہ میں نہیں آسکتے۔

بقول شیخ شبستری۔

معانی ہرگز اندر حرف ناید   کہ بحر بیکراں در ظرف ناید

معانی کسی طرح الفاظ کے اندر نہیں آسکتے جس طرح بحر بیکراں کسی ظرف میں نہیں آسکتا۔

لیکن چونکہ قرآن کی زبان انسانوں کی زبان ہے، اس لئے لطیف ومعنوی چیزوں کو مجبوراً ان عبارات والفاظ سے بیان کیا گیا ہے جن کو انسان مادی چیزوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لیکن غلط فہمی سے بچانے کے لئے بعض آیتوں میں مسائل کو اس طرح بیان کردیا گیا ہے کہ دوسری آیتوں کی مدد سے ان کی تفسیر کی جاسکے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اس لئے ایسے طریقہ کار کو استعمال کیا گیا مثلاً ایک مسئلہ خدا کے دیکھنے کا ہے، یعنی دل کی نگاہوں سے خدا کا دیدار ممکن ہے اس مطلب کو قرآن نے اس طرح ادا کیا ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾

''اس روز بہت سے چہرے تو تروتازہ بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کی نعمت کو دیکھ رہے ہوں گے''۔[۱]

اس جگہ پر قرآن نے دیکھنے (رویت) کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس سے مناسب تر (بظاہر) کوئی لفظ نہیں تھا۔ لیکن اس لفظ (دیکھنے) سے اشتباہ ممکن تھا کہ لوگ سمجھیں گے خدا کو آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے رفع اشتباہ کے لئے دوسری جگہ وضاحت کردی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ

''اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں (نہ دنیا میں نہ آخرت میں) اور وہ (لوگوں کی) نظروں کو خوب دیکھتا ہے''[۲]

---

[۱] سورہ قیامۃ، آیت ۲۲، ۲۳

[۲] سورہ انعام، آیت ۱۰۳

فطری طور سے ہر تلاوت کرنیوالا دونوں آیتوں کو دیکھ کر سمجھ لے گا کہ تشابہ لفظی کے باوجود یہ امور باہم ایک دوسرے سے جدا ہیں۔قرآن اس بات کو روکنے کے لئے کہ کہیں وہ بلند و عالی معانی مادی معانی سے مشتبہ نہ ہوجائیں، اعلان کرتا ہے کہ متشابہات کو محکمات کی طرف پلٹاؤ، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَالَّذِيَّ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ

''وہی وہ خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں کی بعض آیتیں تو محکم (بہت صریح) ہیں کہ وہی اصل بنیاد ہیں''[1]

یعنی وہ آیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان کو ان کے معانی سے خارج نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے دوسرے معانی لئے جا سکتے ہیں یہی ام الکتاب ہیں یعنی آیتوں کی ماں ہیں یعنی جس طرح بچہ ماں کی طرف رجوع کرتا ہے اور ماں بچہ کی مرجع ہے یا جس طرح بڑے شہر ......ام القریٰ......چھوٹے شہروں کے مرجع ہوتے ہیں اسی طرح آیات محکمات متشابہ آیتوں کی مرجع ہیں۔متشابہ آیتیں سمجھنے اور غور کرنے کے لئے ہیں لیکن ان میں غور وفکر آیات محکمات کے سہارے سے کرنا چاہیے۔آیات محکمات کے سہارے کے بغیر متشابہ آیتوں کا جو مطلب اخذ کیا جائے گا وہ غیر معتبر ہوگا۔

کیا قرآن قابلِ شناخت ہے؟

قرآن کے مضامین کو سمجھنے کے لئے جو سوال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا قرآن بنیادی طور سے قابلِ شناخت و قابلِ تحقیق ہے؟ یعنی کیا قرآن کے مطالب و مسائل غور وفکر کے قابل ہیں یا یہ کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا اس کتاب کو صرف ثواب حاصل کرنے اور برکت حاصل کرنے کے لئے یا تلاوت کرنے کے

---

[1] سورہ آلِ عمران آیت ۷

لئے اتارا گیا ہے۔

یہاں پر ممکن ہے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ سوال بے محل ہے کیونکہ قرآن ایسی کتاب ہے جو شناخت ہی کے لئے ہے، اس میں کسی شخص کو کوئی شبہ وتر دید ہی نہیں ہے ......لیکن چونکہ اسلامی دنیا میں مختلف ناپسندیدہ اسباب کی بناء پر قرآن کی شناخت کے سلسلے میں ایسے حالات رونما ہوئے ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کے انحطاط میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے ......اور افسوس کے ساتھ ہمیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسے لچر و لوچ وخطرناک افکار کی جڑیں ہمارے معاشرے میں اب بھی موجود ہیں ......ان کی بناء پر ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں مزید وضاحت کریں۔

شیعہ علماء کے درمیان تین چار صدی قبل کچھ ایسے افراد پیدا ہوئے تھے جنہیں ہم اخباری علماء کہتے ہیں۔ یہ حضرات قرآن کو حجت ہی نہیں مانتے تھے۔علمائے اسلام کی طرف سے اسلامی مسائل کی شناخت کے لئے جو چار مصادر بطور معیار معین کئے گئے تھے (یعنی قرآن، سنت، عقل، اجماع) ان میں سے یہ اخباری علماء تین مصادر کو قبول ہی کرتے نہیں تھے، اجماع کو یہ کہہ کر رد کر دیا کرتے تھے کہ یہ تو سنیوں کی رسم ہے اور سنیوں کی پیروی نہیں کی جاسکتی۔عقل کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کی طرف سے جو کچھ غلطیاں ہوتی ہیں ان پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے اور قرآن کے لئے کہتے تھے کہ اللہ کی کتاب اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ ہم جیسے حقیر لوگ اس کا مطالعہ کر سکیں یا اس میں غور کر سکیں۔صرف پیغمبر اسلامؐ اور آئمہؑ کو یہ حق تھا کہ قرآنی آیات میں غور کر سکیں۔ہمیں صرف تلاوت کا حق ہے۔ لے دے کے ان حضرات کی نظروں میں سنت رسول تھی، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ انہیں اخباری علماء میں سے بعض نے تفسیریں لکھی ہیں، ان تفسیروں میں جہاں آیت قرآنی کے سلسلے میں کوئی حدیث ملتی تھی، اس آیت کو لکھ کر نیچے حدیث لکھ دیتے تھے اور جس آیت کے بارے میں حدیث نہیں ہوتی تھی اس آیت کو لکھتے ہی نہیں تھے، گویا وہ آیت قرآن کا جزو ہی نہیں ہے۔

یہ طریقہ کار قرآن پر ظلم کرنے کے مترادف تھا اور اسی سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس معاشرے میں کوئی آسمانی کتاب ہو اور وہ بھی قرآن جیسی اور پھر معاشرہ اسے پس پشت ڈال دے تو وہ معاشرہ ہرگز قرآن کے راستے پر نہیں چل سکتا۔

اخباریوں کے علاوہ بھی کچھ گروہ ایسے تھے جو قرآن کو عوام کی دسترس سے باہر جانتے تھے۔ ان گروہوں میں اشاعرہ کا نام لیا جاسکتا ہے جو شناخت قرآن کا مطلب آیات قرآنی میں غور وفکر کرنے کو نہیں مانتے تھے بلکہ شناخت قرآن کا مطلب تحت اللفظی معانی کا جاننا قرار دیتے تھے۔ یعنی قرآن کے ظاہری لفظ سے جو معنی سمجھ میں آتے ہیں انہی کو قبول کر لینا چاہئے۔ اس کے باطن سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ ان کا عقیدہ تھا۔ فطری بات ہے کہ قرآن کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرنا بہت جلد انحراف وگمراہی کا سبب بن گیا کیونکہ یہ لوگ بھی آیات کی توضیح کرنے پر مجبور تھے لیکن چونکہ عقل کو معطل کر رکھا تھا اس لئے قہری طور پر قرآن سے عوامی باتیں ہی سمجھتے تھے اور اسی طریقہ کار کی بناء پر بہت جلد سیدھے راستے سے منحرف ہوجاتے اور غلط عقائد کے قائل ہوجاتے تھے۔ مثلاً تجسم کا عقیدہ...... یعنی خدا جسم رکھتا ہے...... خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کا عقیدہ، بشری زبان سے خدا سے گفتگو کرنے کا عقیدہ اور اسی قسم کے دیگر باطل عقائد کے قائل ہو گئے تھے۔

ان لوگوں کے مقابلے میں جنہوں نے بنیادی طور سے قرآن چھوڑ رکھا تھا۔ ایک دوسرا گروہ پیدا ہو گیا جنہوں نے اپنے اغراض ومقاصد کو حاصل کرنے کے لئے قرآن کو ذریعہ بنالیا۔ جس طرح بھی ان کا مقصد پورا ہوتا ہو اسی طرح قرآنی آیتوں کی تاویل کرلیا کرتے تھے اور قرآن کی طرف ایسے مسائل کو منسوب کردیتے تھے جس سے روح قرآن واقف بھی نہیں تھی اور اسی کے ساتھ ہر اعتراض کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کرتے تھے کہ آیات کی باطنی تفسیر صرف ہم جانتے ہیں اور جو بات ہم کہہ رہے ہیں یہ باطن آیات کو سمجھ کر ہی کہہ رہے ہیں۔

تاریخ اسلام میں اس قسم کے دو گروہوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

اول: اسماعیلیہ (انہیں کو باطنیہ کہا جاتا ہے) دوم: صوفیہ، اسماعیلی حضرات زیادہ تر تو

ہندوستان میں ہیں لیکن تھوڑے، بہت ایران میں بھی ہیں ان لوگوں کی مصر میں ایک مدت تک حکومت بھی رہ چکی ہے۔ جو فاطمی حکومت کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ اسماعیلی حضرات شیعوں کی اصطلاح میں ''شش امامی'' کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود حتمی ویقینی طور سے اور تمام علماء شیعہ دوازدہ امامی کے اتفاق واجماع کی بناء پر یہ لوگ ''یعنی شش امامی'' ہر غیر شیعہ فرقہ کی بہ نسبت سب سے زیادہ شیعوں سے یہی حضرات دور ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ اہلسنت جو شیعوں کے کسی بھی امام سے اس طرح کی عقیدت نہیں رکھتے جیسے کہ شیعہ رکھتے ہیں اس کے باوجود بھی اہلسنت بہ نسبت شش امامی حضرات کے شیعوں سے نزدیک تر ہیں۔[۱]

اسماعیلیوں نے اپنی باطنی گری کا چکر چلا کر تاریخ اسلام میں بہت بڑی بڑی خیانتوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اسلامی مسائل میں ضرورت سے زیادہ انحراف پیدا کیا ہے

اسماعیلیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صوفی فرقہ بھی آیات کی تحریف وتاویل کرنے میں اپنے شخصی عقائد کے پیش نظر کافی یدطولیٰ رکھتا ہے۔ میں یہاں پر ان کی تفسیروں میں سے صرف ایک تفسیر کا ذکر نمونۃً کروں گا تاکہ ان کے طریقے واضح ہو جائیں اور ہمارے قاری حضرات اس اجمال سے تفصیل کا اندازہ لگائیں۔

قرآن نے جہاں پر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کا قصہ بیان کیا ہے وہاں اس طرح ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو چند بار اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا

---

[۱] ایک کانفرنس ''اسلامی مذاہب میں نزدیکی کیسے کی جائے''؟ کے عنوان پر ۳۵ سال قبل (یعنی کتاب لکھتے وقت ۳۵ سال ہو چکے تھے اب زیادہ ہو گئے ہیں: مترجم) تشکیل دی گئی تھی اور اس میں تمام مذاہب کے افراط غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ کچھ حضرات فرقہ اسماعیلیہ کی نمائندگی کرنے کے لئے آئے تھے لیکن وہاں سنیوں اور شیعوں نے بالاتفاق یہ کہہ کر کہ ہم لوگ آپ حضرات کو اسلامی فرقوں میں شمار نہیں کرتے، انہیں کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی

حکم خواب میں دیا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے تو تعجب کیا لیکن جب کئی بار خواب میں یہی حکم ہوا تو انہیں یقین ہو گیا اور وہ پروردگار کا حکم بجالانے پر آمادہ ہو گئے اور جناب اسماعیلؑ سے بھی صورتحال بیان کی تو اسماعیلؑ بھی خلوص دل کے ساتھ قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور خدا کا مقصد بھی یہی تھا کہ حکم خدا پر یہ حضرات راضی ہو جائیں اور یہی وجہ ہے کہ جب باپ بیٹے خلوص دل سے صفائی قلب کے ساتھ خدا کا حکم بجالانے کے لئے آمادہ ہو گئے تو خدا نے اس حکم کو روک دیا اور اس کے بدلے میں فدیہ قرار دے دیا: مترجم) اسی واقعہ کو صوفی حضرات کہتے ہیں ابراہیمؑ سے مراد عقل ہے، اور اسماعیلؑ سے مراد نفس، یعنی عقل کا ارادہ تھا کہ نفس کو ذبح کر دے۔

ظاہری بات ہے کہ یہ قرآن کے ساتھ کھلواڑ ہے اور ایک واضح قسم کا انحراف ہے اور اسی قسم کی بازی گری، حسب منشاء، حسب مصلحت قرآن کا ترجمہ کر دینے سے آنحضرتؐ نے یہ کہہ کر روکا تھا:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَئْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ فِی النَّارِ

''جو شخص اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر بیان کرے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔ آیات قرآنی کے ساتھ اس قسم کی بازی قرآن کے ساتھ بہت بڑی خیانت ہے۔

قرآن مجید نے اخباریوں کے جمود و خشک فکری وغیرہ اور اسماعیلیوں وغیرہ کے انحرافات اور من مانی کرنے پر پابندی لگاتے ہوئے ایک بیچ کا راستہ پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ منصفانہ اور بے غرضانہ غور و فکر و تامل کو اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن نے صرف مومنین ہی کو نہیں بلکہ مخالفین تک کو آیات قرآنی میں غور و فکر و تامل کی دعوت دی ہے کہ قرآن پر اعتراض کرنے کے بجائے اس کی آیتوں میں غور و فکر کرو۔ چنانچہ مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ''آخر یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے، یہ کیسے دل ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ان پر مہر لگا دی گئی ہے'' (س محمد، آیت ۲۴) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ﴿۲۹﴾

(اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کتاب (قرآن) جو ہم نے تمہارے پاس نازل کی ہے (بڑی) برکت والی ہے (کیوں؟) تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں) یعنی اس کتاب کو اس لئے نہیں نازل کیا گیا ہے کہ اس کو چوم کر طاق میں رکھ دیں بلکہ اس لئے اتارا گیا ہے کہ اس کی آیتوں میں غور کریں اور صاحبان عقل وخرد اس سے آگاہی حاصل کریں۔[1]

یہ آیتیں اوران کے علاوہ دسیوں وہ آیتیں جو قرآن میں غور کرنے کی تاکید کرتی ہیں سب کی سب تفسیر قرآن کے مجاز ہونے کی تائید کرتی ہیں لیکن وہ تفسیر جو میلان وخواہش نفس کی بناء پر نہ ہو بلکہ انصاف وصداقت اور کسی خودغرضی ونفسانیت پر مبنینہ ہو، جس وقت ہم قرآن میں خودغرضی ونفسانیت کے بغیر غور کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہم قرآن کے تمام مسائل کا حل ڈھونڈ لیں بلکہ اس اعتبار سے قرآن فطرت کے مشابہ ہے جس طرح فطرت کے بہت سے راز ابھی تک حل نہیں ہو سکے اور موجودہ زمانے میں بھی ان کے حل کا امکان نہیں ہے (اسی طرح قرآن کو بھی سمجھنا چاہیے) ہاں یہی مسائل ممکن ہے مستقبل میں حل ہو جائیں اس کے علاوہ انسانی طبیعت کی شناخت میں اپنے افکار کو جس طرح طبیعت ہے اسی کے مطابق کرنا چاہیے نہ کہ طبیعت کی توجیہہ وتفسیر اپنی رائے کے مطابق کرے، اسی طرح قرآن بھی طبیعت کی طرح ایک کتاب ہے جو کسی ایک زمانے کے لئے نازل نہیں ہوئی اور اگر قرآن کسی ایک زمانے کے لئے ہوتا تو اب تک اس کے تمام رازوں سے پردہ اٹھ چکا ہوتا اور اس آسمانی کتاب کی جاذبیت، تازگی اور اثر اندازی ختم ہو

---

[1] پ ۲۳، س ۳۸، آیت ۲۹

چکی ہوتی لیکن صورتحال اس کے برخلاف ہے۔تدبر وتفکر سے ہمیشہ قرآن کے لئے کشف جدید ہے اور اسی نکتہ کی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توضیح فرمائی ہے۔ ایک حدیث نبوی میں ہے:''قرآن چاند وسورج کی طرح ہے جس طرح وہ دونوں ہمیشہ حرکت میں ہیں یعنی ایک جگہ ثابت وگڑے ہوئے نہیں ہیں (اسی طرح قرآن کے تدبر سے نئے نئے معانی ظاہر ہوتے ہیں'': مترجم)اسی طرح رسولؐ کا ارشاد ہے:''قرآن کا ظاہر بہت خوبصورت اور باطن بہت گہرا ہے''۔کتاب''عیون اخبار رضا''میں امام رضاؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا:''اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن پر جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے اور جتنی زیادہ اس کی تلاوت ہوتی ہے اس کی تر وتازگی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے؟ امام نے فرمایا: قرآن کسی ایک زمانے اور کچھ لوگوں کے لئے نازل نہیں کیا گیا بلکہ تمام زمانوں اور تمام لوگوں کے لئے نازل کیا گیا ہے۔قرآن کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر زمانے میں تمام ان اختلافات کے باوجود جو طرز تفکر، معلومات، وسعتِ افکار میں دکھائی دیتے ہیں پھر بھی قرآن تمام زمانوں اور تمام افکار پر فوقیت رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ تلاوت کرنے والوں کے لئے بہت سے مجہولات رکھنے کے باوجود اتنے زیادہ معانی و مفاہیم قابل ادراک پیش کرتا ہے کہ جس سے ظرف زمان مملو ہو جاتا ہے۔



فصل اوّل

قرآن کی شناختِ تحلیلی

اس حصے میں قرآن کے مضامین کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اگر قرآن کے ایک ایک موضوع کو بیان کرنا چاہوں تو اس کے لئے سترمن کاغذ کی ضرورت ہوگی، اس لئے پہلے میں کلیات کو پیش کروں گا، اس کے بعد بعض جزئیات کا بھی ذکر کروں گا۔

قرآن نے بہت سے مطالب سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں بعض مطالب پر زیادہ تکیہ کیا ہے اور بعض پر کم جو مسائلِ قرآن میں بیان کئے گئے ہیں ان میں خداوند عالم اور کائنات کے مسائل زیادہ ہیں۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ قرآن خدا کی معرفت کس طرح کرتا ہے کیا یہ معرفت بعنوان فلسفیانہ ہے یا بطور عرفان؟ اسی طرح کیا یہ دیگر مذہبی کتابوں تورات وانجیل کی طرح ہے یا مکاتبِ ہندی کی شکل وصورت میں ہے؟ یا یہ خدا کی معرفت میں بالکل مستقل طریقہ کو اختیار کرتا ہے اس میں کسی کی تقلید نہیں کرتا۔

ایک مسئلہ قرآن میں دنیا کا ہے، اس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کائنات کے بارے میں قرآن کا کیا نظریہ ہے؟ آیا خلقت وکائنات کو عبث وبازیچۂ اطفال جانتا ہے یا اسے برحق سمجھتا ہے؟ آیا کائنات کو ایک سلسلۂ سنن ونوامیس وعلل ومعلول جانتا ہے؟ یا اسے بے قاعدہ وبے ہودہ شمار کرتا ہے یعنی کوئی چیز کسی چیز کے لئے شرط نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن میں بطور کلی ایک مسئلہ انسان کا پیش کیا گیا ہے۔ انسان کے سلسلے میں قرآنی نظریہ کیا ہے۔ یہ بات بھی تحلیل کے قابل ہے کہ آیا قرآن انسان کے بارے میں مثبت نظریہ رکھتا ہے یا منفی؟ اور انسان کو حقیر سمجھتا ہے یا اس کی عظمت و کرامت کا قائل ہے؟

ایک دوسرا مسئلہ انسانی معاشرے کا بھی ہے کہ آیا قرآن انسانی معاشرہ کی اصالت و شخصیت کا قائل ہے یا اس کی نظر میں معاشرہ کچھ بھی نہیں، اصالت صرف افراد کو حاصل ہے؟ اور آیا قرآنی نظریہ زندگی، موت، ترقی، تنزلی کے بارے میں یہ ہے کہ یہ چیزیں درحقیقت معاشرے کی صفات ہیں یا صرف افراد کی صفات ہیں؟ اسی جگہ سے تاریخ کا بھی مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ تاریخ کے بارے میں قرآنی نظریہ کیا ہے؟ تاریخ کی محرک طاقتیں قرآن کی نظر میں کون ہیں؟ اور فرد تاریخ میں کس قدر مؤثر واقع ہوا ہے؟

ان کے علاوہ بہت سے دوسرے مسائل بھی قرآن میں پیش کیے گئے ہیں یہاں پر بطور فہرست میں چند کی طرف اشارہ کروں گا۔ منجملہ ان مسائل کے ایک یہ ہے کہ خود اپنے بارے میں قرآن کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے بعد قرآن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسئلہ ہے اور یہ کہ قرآن پیغمبرؐ کا تعارف کس طرح کراتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیسی گفتگو کرتا ہے .... اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ قرآن میں مومن کی کیا تعریف ہے، اور مومنین کے کیا صفات ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان مباحث میں ہر بحث کے بہت سے شعبے ہیں، مثلاً جب ہم انسان کے بارے میں بحث کریں گے تو فطری طور پر اخلاق کے بارے میں بھی بحث کرنا ہوگی یا جس وقت معاشرے کے بارے میں بحث ہوگی تو قہری طور سے روابط افراد، مسئلہ امر بہ معروف و نہی از منکر، اجتماعی طبقات وغیرہ کے بارے میں بحث کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔



قرآن اپنے لئے کیا کہتا ہے؟

قرآن کے مضامین کی تحلیل کے سلسلے میں سب سے بہتر طریقہ کار یہ ہے کہ ہم پہلے قرآن ہی کو دیکھیں کہ اپنے بارے میں اس کا کیا نظریہ ہے؟ اور وہ اپنے آپ کو کس طرح پہنچواتا ہے؟ سب سے پہلی بات جو قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تمام کلمات اور اس کی تمام عبارتیں خدا کا کلام ہیں۔ قرآن صریحی طور سے کہتا ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف ان ہی چیزوں کو بیان کرتے ہیں جو ان پر روح القدس یا جبرائیل کے ذریعے نازل ہوتی ہیں۔

دوسری وضاحت جو قرآن اپنے بارے میں کرتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن لوگوں کو ہدایت کرنے والا اور ان کو تاریکی سے نور کی طرف لانے والا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ قرآن وہ) کتاب ہے جس کو ہم نے تمہارے پاس اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو (کفر کی) تاریکی سے (ایمان کی) روشنی میں نکال لاؤ۔[1]

یقیناً ان تاریکیوں کے مصادیق میں سے ایک مصداق جہالت و نادانی بھی ہے۔ قرآن بشر کو اس تاریکی سے علم کی طرف لاتا ہے، لیکن اگر تاریکیاں صرف نادانی کا نام ہوتا

[1] سورۃ ابراہیم آیت ۱

تو فلسفی حضرات بھی یہ کام کر سکتے تھے لیکن دنیا میں ظلمت نادانی سے زیادہ خطرناک ظلمتیں موجود ہیں جن کا مقابلہ علم کی طاقت سے باہر ہے۔ مثلاً منفعت پرستی، خود پرستی، خواہشات کی پیروی وغیرہ ایسی تاریکیاں ہیں جو افرادی واخلاقی تاریکیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اجتماعی تاریکی کی مثال ظلم وستم وغیرہ سے دی جا سکتی ہے اور عربی زبان میں لفظ ظلم مادۂ ظلمت ہی سے ماخوذ ہے (جس کا مترادف فارسی میں ستم ہے) جو اجتماعی اور معنوی تاریکی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان تاریکیوں کا مقابلہ کرنا قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کا کام ہے۔ قرآن جناب موسیٰؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے

اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ

(اور ہم نے موسیٰؑ کو حکم دیا) اپنی قوم کو (کفر کی) تاریکیوں سے (ایمان کی) روشنی میں نکال لائیں۔[1]

اس تاریکی سے مراد وہی فرعون وفرعونیوں کا ظلم وستم ہے اور نور سے مراد نور آزادی وعدالت ہے۔

اہل تفسیر نے ایک نکتہ یہاں پر بیان کیا ہے کہ قرآن نے ہمیشہ ''الظلمات'' کہا ہے یعنی جمع محلیٰ بالف ولام استعمال کیا ہے جو استغراق پر دلالت کرتا ہے اور تمام تاریکیوں کو شامل ہے، اس کے برخلاف لفظ نور کو ہمیشہ مفرد استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صراط مستقیم صرف ایک ہے، لیکن انحراف وگمراہی متعدد ہیں[2]

اس طرح قرآن اپنے مقصد کو معین کرتا ہے کہ اس کا ہدف یہ ہے: تمام جہالت و گمراہی اور اجتماعی واخلاقی ستم وتباہی کی زنجیروں کو توڑنا! جس کو ایک کلمہ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے تاریکیوں کو ختم کر کے عدل وخیر، روشنی ونور کی طرف ہدایت کرنا۔

---

[1] سورہ ابراہیم آیت ۵

[2] مثلاً آیت الکرسی میں ہے: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ یُخۡرِجُوۡنَهُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ

عربی زبان کی جانکاری

ایک دوسرا مسئلہ قرآن کی زبان کی جانکاری اور اس کی تلاوت کا بھی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ تلاوت قرآن کا مطلب صرف ثواب کے لئے اس کے حروف کی تلاوت کرنا ہے جس میں معنی کے سمجھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ قرآن کا دورہ کرتے رہتے ہیں لیکن اگر ایک مرتبہ بھی ان سے پوچھ لیا جائے کہ جو آپ تلاوت کرتے ہیں اس کا مطلب بھی جانتے ہیں؟ تو یہ جواب دینے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت اس اعتبار سے کہ معانی قرآن سمجھنے کا مقدمہ ہے یہ بہت اچھی بات ہے لیکن صرف ثواب کی نیت سے پڑھنا کافی نہیں ہے۔[1]

قرآن کے معنی سمجھنا بھی خصوصیات کا حامل ہے اس کی طرف بھی توجہ رکھنی چاہیے۔ بہت سی کتابوں کو یاد کرنے کے لئے پڑھنے والے کو جو بات حاصل ہوتی ہے وہ تازہ افکار کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو قاری کے ذہن میں پہلے سے موجود نہیں تھا۔ پڑھنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہاں صرف پڑھنے والے کی عقل اور قوت فکر ہی ہے جو فعالیت میں مشغول ہوتی ہے لیکن قرآن کے سلسلے میں بغیر کسی شک وشبہ کے یہ بات طے ہے کہ اس کو سیکھنے اور سکھانے کے لئے پڑھنا چاہیے اور خود قرآن نے بھی یہی بات کہی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ صرف تلاوت کا بھی ثواب ہے چاہے معنی نہ سمجھے، ہاں اگر معنی بھی سمجھتا ہوتو نور علی نور ہے مترجم

كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ﴿۲۹﴾[1]

قرآن کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ تعلیم دے اور اس سلسلے میں قرآن کا تخاطب عقل سے ہے اور قرآن عقل سے منطق و استدلال کے ذریعے گفتگو کرتا ہے۔ البتہ ایک بات اور ہے قرآن کے پاس ایک دوسری زبان بھی ہے جس کا مخاطب دل ہے، اس دوسری زبان کا نام احساس ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سے مانوس ہونا چاہتا ہے تو اس کو ان دونوں زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اور دونوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں میں جدائی ڈالنے کا نتیجہ اشتباہ و خطا اور گھاٹے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

ہم جس چیز کو دل کہہ رہے ہیں اس سے ہماری مراد بہت ہی عظیم و عمیق احساس ہے جو انسان کے باطن میں موجود ہے جس کی تعبیر کبھی احساس ہستی سے بھی کی جاتی ہے یعنی انسان کا وہ احساس جو ہستی مطلق سے ارتباط رکھتا ہے، جو شخص دل کی زبان کو جانتا ہے اور اس زبان سے انسان کو مخاطب کرتا ہے، وہ اس کو ہستی کی گہرائی اور اس کے حقیقتِ وجود سے باہر لاتا ہے۔ اور پھر اس وقت صرف انسان کا دماغ اور اس کی فکر ہی متاثر نہیں ہوتی بلکہ اس کا پورا وجود متاثر ہوتا ہے بطور نمونہ احساس کی زبان کو موسیقی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ موسیقی کی تمام قسمیں اپنے پورے اختلاف کے باوجود ایک چیز میں سب ہی مشترک ہیں اور وہ انسانی احساسات و جذبات کو متاثر کرنا ہے۔ موسیقی انسان کی روح میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور اس کو احساس کی ایک مخصوص دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ موسیقی کے اختلاف سے جذبات و احساسات میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ مثلاً موسیقی کی ایک قسم وہ بھی ہے جو بزدل انسان کے اندر بھی بہادری و جوش پیدا کر دیتی ہے آپ نے میدان جنگ میں دیکھا ہوگا کہ جب فوجی باجہ بجنے لگتا ہے تو کبھی کبھی اس کا اثر اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ جو فوجی دشمن کے ڈر سے اپنے ٹھکانے

---

[1] پ ۲۳، س ۳۸، آیت ۲۹ اس کا ترجمہ گزشتہ صفحے پر گزر چکا ہے۔

سے باہر آتے ہوئے ڈرتا ہے وہ فوجی نغمہ کو سن کر دشمن کے مسلسل حملوں کے باوجود اپنے مورچے سے باہر آ کر بڑی بے جگری سے پیش قدمی کرنے لگتا ہے۔

اسی موسیقی کی ایک دوسری قسم ہوتی ہے جو انسان کی شہوت کو بھڑکا دیتی ہے اور انسان کو اتنا سست و بے خود بنا دیتی ہے کہ وہ شہوت کے ہاتھوں بدکاری پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس سلسلے میں موسیقی جتنا انسانی جذبات کو ابھارتی ہے دنیا کی کوئی شے نہیں ابھار پاتی تو شاید غلط نہ ہوگا۔ جب محفل رقص و سرود جوش پر آ جاتی ہے تو انسان اپنی عفت وعصمت کی دیوار کو توڑ دیتا ہے۔ تمام احساسات کو اسی کی زبان سے ابھارا جا سکتا ہے، خواہ وہ موسیقی ہو یا کوئی اور چیز اس سے احساسات پر کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہر انسان کے جذبات واحساسات میں ایک حس مذہبی وخدا کی تلاش ہے اور قرآن عظیم وشریف حس سے بھرپور تعلق رکھتا ہے۔

مشرق ومغرب میں اس حس دینی کے بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں ہم دنیا کے مفکرین میں سے صرف ایک دو کی رائے کو یہاں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس سلسلے میں آئن سٹائن .... کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے ایک مقالے میں مذہب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میرے نظریے کے مطابق دنیا میں بطور کلی تین قسم کے مذاہب کا وجود ہے۔

۱۔ ترس وخوف کا مذہب: یعنی ان لوگوں کا مذہب جنہیں مذہب کی طرف ابھارنے والی چیز فطرت کا ایک ڈراؤنا سلسلہ ہے جو اس کائنات میں ہے۔

۲۔ مذہب اخلاق: اس کی مراد اس مذہب سے وہ مذہب ہے جس کی بنیادیں اخلاقی مصالح پر استوار کی گئی ہوں۔ اس کے بعد آنسٹائن .... نے ایک اور مذہب کا ذکر کیا ہے اور اس کا نام ''مذہب ہستی'' رکھا ہے۔ موصوف کی اس تعبیر کا مطلب وہی ہے جس کو ہم نے ''دل'' کہا ہے۔ آنسٹائن .... کا نظریہ اس مذہب کے بارے میں یہ ہے: انسان پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں انسان کی معنوی وروحانی حالت اجاگر ہو جائے گی اور اس حالت میں اپنی حقیر و بے معنی آرزوؤں اور امیدوں میں گھرا ہوا اور محدود ومقید کیا ہوا۔ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے والا، اسی طرح اپنے اس عالم ہستی طبعی میں محصور انسان دفعتاً اپنی اس قید وبند کی زنجیروں سے باہر آ جائے گا اور اس زندان سے چھوٹ جائے گا اور اس وقت کل ہستی کے نظارے میں مشغول ہو جائے گا اور وجود کو مثل ایک حقیقت واحدہ کے پائے گا اور

مابعد الطبیعات کے شکوہ وعظمت وجلال کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور اس وقت اپنی حقارت وناچیزی کو یاد کرے گا اور چاہے گا کہ کل ہستی سے متصل ہوجائے۔ آنسٹائن کی یہ تعبیر ہمام کی داستان کو یاددلاتی ہے کہ ہمام حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ سے مومن کی صفات کو پوچھ رہے تھے تو حضرت علیؑ نے ان کے جواب میں ایک ایسی بات کہی جو تھی تو بہت مختصر لیکن بہت ہی جامع اور مکمل: فرماتے ہیں: یاھمام اتق اللہ واحسن ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔(نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۳)''اے ہمام تم خود اپنے خدا سے ڈرو اور نیکوکار بن جاؤ کیونکہ خدا نیک اور پرہیزگار بندوں کے ساتھ ہے''۔ لیکن ہمام صرف اتنے مختصر سے جواب پر راضی نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ حضرتؑ سے ان کے شب وروز، معاشرت وطرز عبادت و طریقہ زندگی کو بھی معلوم کریں۔ اس لئے سوال کرتے ہیں تو پھر حضرت علیؑ صفات مومن بیان فرماتے ہیں اور تقریباً ۱۳۰ صفتیں بیان فرماتے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے: لولا الاجال التی کتب اللہ لھم لم تستقر ارواحھم فی ابدانھم طرفۃ عین. ''اگر خدا کی طرف سے معین کردہ موت کی مدت نہ ہوتی تو چشم زدن کے برابر بھی ان کی روحیں ان کے بدنوں میں نہ ٹھہرتیں، یہ وہی حالت ہے جس کی طرف آنسٹائن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: مذہبی انسان اپنے وجود کو ایک قسم کا قیدخانہ خیال کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے پنجرہ جسم سے پرواز کر جائے اور تمام ہستی کو یکبارگی بعنوان ایک واحد پالے۔ حضرت علیؑ نے اس حقیقت کو بہت زیادہ جامع بزرگ اور شدید تر صورت میں بیان کیا ہے۔ حضرت علیؑ کے نظریے کے مطابق مرد مومن اپنی پوری ہستی کو اپنے مادی بدن کے اندر جمع کئے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ناگہانی طور پر اپنے جسم کو چھوڑ کر اپنی روح کو آزاد کرلیتا ہے۔ ہمام کے قصہ میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ کی گفتگو ختم ہوئی تو ہمام کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

انسان کی حس معنوی کے بارے میں اقبال نے بھی بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ بات بہت واضح ہے کہ دعا و پرستش ایک اشراقی نفسانی کے عنوان سے ایک حیاتی اور متعارف عمل ہے کہ اس چھوٹے سے جزیرے کے طفیل ہماری شخصیت اپنی وضعیت کا ایک ایسے کل میں اکتشاف کرتی ہے جو حیات سے بزرگ تر ہے۔ ولیم جیمز نے بھی اسی سلسلے میں ایک بات کہی ہے: پرستش کی تڑپ اس امر کا ضروری نتیجہ ہے کہ ہر شخص کے خود اختیاری وعملی کے عمیق ترین حصہ ہونے کے باوجود ایک قسم کی اجتماعی خودی ہے جو ان تمام مصیبتوں کے باوجود اپنے کو دنیائے فکر کے اندر تلاش کرسکتی ہے۔ زیادہ تر لوگ خواہ مسلسل یا اتفاقی طور سے دل ہی دل میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روئے زمین کی حقیر ترین فرد اس بلند و برتر توجہ کے ساتھ اپنے کو ایک واقعی وقیمتی احساس کرتی ہے (یہ بھی) احتمال ہے کہ لوگ تاثیر پذیری کے درجے کے اعتبار سے ایک

دوسرے سے مختلف ہوں، بعض لوگوں کے لئے دوسروں سے زیادہ یہی توجہ خود آگاہی کی بنیادی قسمت کی تشکیل کرتی ہے اور جو لوگ ایسے زیادہ ہیں وہ بیشتر متدین تر ہیں لیکن میں اطمینان رکھتا ہوں کہ وہ لوگ بھی جو بطور کلی اس کے فاقد ہیں وہ اپنے کو فریب دیتے ہیں اور واقعاً وہ بھی کسی نہ کسی حد تک ایمان رکھتے ہیں

قرآن نے خود تعلیم دی ہے کہ قرآن کہ خوش الحانی سے پڑھا کرو، اور یہ وہی آسمانی صدا ہے کہ قرآن اپنی فطرت الٰہی کی بناء پر انسان سے گفتگو کرتا ہے اور اسے مسخر کر لیتا ہے۔[1]

قرآن اپنی توصیف کے لئے دو زبان کا قائل ہے، کبھی تو اس نے اپنے کو کتاب تفکر و منطق کہا ہے اور کبھی اپنا تعارف کتاب احساس و عشق کے ذریعے کرایا ہے۔ یعنی یوں سمجھیے کہ قرآن صرف عقل و فکر کے لئے غذا نہیں مہیا کرتا بلکہ روح کے لئے بھی غذا فراہم کرتا ہے۔ قرآن اپنی مخصوص موسیقی کے لئے بہت تاکید کرتا ہے، جس موسیقی کا اثر انسان کے عمیق و بلند احساسات کو تمام موسیقیوں سے زیادہ ابھارتا ہے۔ خود قرآن اس موسیقی کی تعلیم مومنین کو دیتا ہے تا کہ رات کے کچھ حصے تک مومنین تلاوت قرآن میں مشغول رہیں اور اپنی نمازوں میں خدا کی طرف توجہ رکھتے ہوئے قرآن کی تلاوت کریں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قرآن مخاطب کر کے کہتا ہے:

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ﴿۴﴾ الخ

''اے کملی اوڑھنے والے (رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)! راتوں کو (عبادت کے لئے) کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات یا کچھ زیادہ اور قرآن کو

---

[1] حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام کے لئے اتفاقی و اجماعی طور سے ثابت ہے کہ جب آپ حضرات قرآن کی تلاوت فرماتے تھے تو اس خوش الحانی سے تلاوت ہوتی تھی کہ راستے چلتے ہوئے لوگ ان کی آواز کو سن کر بے اختیار ٹھہر جایا کرتے تھے، ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی اور وہ بے تحاشا رونے لگتے تھے

ترتیب سے پڑھا کرو‘‘۔[۱]

ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ اتنی جلدی جلدی نہ پڑھو کہ الفاظ ہی سمجھ میں نہ آئیں اور نہ اتنی سست رفتاری سے پڑھو کہ باہم الفاظ کا رابطہ ہی ٹوٹ جائے۔ یعنی آہستہ وسکون کے ساتھ آیتوں کے معانی پر غور کرتے ہوئے پڑھو۔ پھر اسی سورہ میں بعد کی آیات میں ارشاد ہوتا ہے اگر روزانہ کے کاموں کے لئے مثلاً تجارت، جہاد وغیرہ کے لئے زیادہ آرام کی ضرورت ہو تو بھی خلوت میں یاد خدا اور عبادت خدا سے غافل نہ ہو۔

مسلمانوں کے درمیان جو چیز مایۂ نشاط اور قدرتِ روحی اور خلوص وصفائے باطن پیدا کرنے کی تھی وہ صرف قرآن کی موسیقی تھی۔ قرآن کی آسمانی آواز نے بہت ہی مختصر سی مدت کے اندر جزیرۃ العرب کے وحشی لوگوں کو ایسا ثابت قدم مومن بنا دیا جنہوں نے اپنے زمانہ کی بڑی بڑی طاقتوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور ان کو شرمناک شکست دی۔ اس زمانے کے مسلمان قرآن کو صرف ایک کتاب درس وتدریس ہی نہیں سمجھتے تھے کہ جو غذائے روح اور اضافہ طاقت وزیادتی ایمان کا سبب ہو بلکہ راتوں کو بڑے خلوص کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔[۲]

راتوں کو اپنے خدا سے راز ونیاز کرتے تھے اور دن کو شیر نر کی مانند دشمنوں پر حملہ کرتے تھے۔ قرآن بھی مومنین سے اسی چیز کی توقع رکھتا تھا چنانچہ خدا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کر کے کہتا ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲[۳]

---

[۱] س مزمل آیت ۲۰۱

[۲] امام زین العابدین d نے ختم قرآن کی جو دعا تعلیم کی ہے اس میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدایا رات کی تاریکیوں میں قرآن کو ہمارا مونس قرار دے ہمیں ایسا عشق اور ایسی سمجھ عطا کر دے جس سے رات کی تاریکیوں میں اس کتاب سے انس والفت پیدا ہو جائے

[۳] سورہ فرقان، آیت ۵۲

کافروں کی باتوں کو نہ سنیئے ان سے زبردست طریقہ سے جنگ کیجئے،

اور پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اس قول کی سچائی کی تصدیق کرتی ہے۔ پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جب کوئی مددگار نہ تھا اس وقت بھی آپ تن تنہا قرآن کو ہاتھ میں لے کر قیام کرتے تھے اور یہی قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سب کچھ تھا، یہی قرآن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے فدائی پیدا کرتا تھا، اسلحہ جنگ مہیا کرتا تھا، طاقت اکٹھی کرتا تھا، دشمن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرتا تھا، دشمنوں کو آپ کی طرف کھینچ کر لاتا تھا اور ان کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتا تھا اور اس طرح کے وعدہ کی صداقت کا اثبات کرتا تھا۔ [1]

جب قرآن اپنی زبان کو دل کی زبان کہتا ہے تو اس سے مراد وہ دل ہوتے ہیں جو آیات خدا سے اپنے اوپر صیقل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی صفائی کرنا چاہتے ہیں اور یہ زبان موسیقی کی زبان کے علاوہ ہے کیونکہ موسیقی کی زبان کبھی کبھی انسان کے شہوانی جذبات کو بھی ابھار دیتی ہے اور فوجی زبان وجنگی زبان کے بھی علاوہ ہے کیونکہ جنگی زبان سے حس شجاعت ابھرتے ہیں بلکہ یہ وہ زبان ہے جو بدوعرب سے ایسے مجاہد پیدا کر دیتی ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے: حملوا بصائرھم علی اسیافھم۔ ''ایسے لوگ جنہوں نے اپنی پہچان، اپنی بینائی، اپنے روشن افکار، الٰہی معلومات اور اپنی معنویت کو اپنی تلواروں پر رکھ دیا تھا اور جن کی تلواریں اسی آئیڈیا وافکار پر کام کرتی تھیں۔

ان لوگوں کی نظروں میں فردی مسائل اور شخصی منافع کبھی نہیں تھے حالانکہ یہ لوگ معصوم نہیں تھے بلکہ خطا کار تھے لیکن قائم اللیل اور صائم النہار (رات بھر عبادت کرنے والے اور دنوں کو روزہ رکھنے والے) کے سچے مصداق تھے۔ ہر وقت ہستی کی گہرائیوں کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ راتوں کو عبادت کرتے تھے، دنوں کو جہاں میں مشغول

---

[1] ہمارے زمانے میں بھی خدا کا یہ سچا وعدہ پورا ہوا اور نسل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص امام خمینی m طاب ثرہ جو شل اپنے جدک صرف قرآن وایمان پر بھروسہ کرتا تھا، لشکر کفار کو شرمناک ترین شکست دی

رہتے تھے۔[1]

قرآن اپنی اسی خاصیت کی وجہ سے دل وروح کی کتاب ہے، ایسی کتاب ہے جس سے روح میں تڑپ پیدا ہوتی ہے، آنکھوں سے اشک جاری ہونے لگتے ہیں، دلوں میں کپکپی پیدا ہوجاتی ہے۔

قرآن ایک اور گروہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے آیات قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان پر خضوع وخشوع کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور وہ کہتے ہیں جو کچھ اس کتاب میں ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ یہ سب کا سب حق ہے، یہ کہتے ہیں، اور ان کے خضوع میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں سے عیسائی مسلمانوں سے بہت قریب ہیں اور یہودی ومشرکین بہت دور ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ

---

[1] حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ کے اس خطبے کے اندر جو متقین کے نام سے مشہور ہے، (خطبہ ۱۹۳) متقین کی صفات گنانے کے بعد وضاحت فرمایا ہے: وہ گفتار میں ایسے اور رفتار میں ایسے اور ان کے تمام تر حالات کی تشریح فرماتے ہیں۔ بقول شیخ سعدی: مردان خدا کی راتوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اما الليل فصافون اقدامهم (رات کے وقت عبادت کے لئے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں) تالین لاجزاء القرآن (قرآن کے مختلف حصوں کی تلاوت کرتے ہیں) یرتلونها ترتیلاً، (یعنی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، غور وفکر تامل کے ساتھ نہ بعض لوگوں کی طرح جو تیز رفتار پانی کی رفتار سے پڑھتے ہیں اور معانی نہیں سمجھتے۔ یحزنون به انفسهم (یعنی کلمات وآیات کو دل سے پیدا ہونے والے مخصوص حزن معنوی اور آہنگ کے ساتھ پڑھتے ہیں) جب کسی آیت رحمت پر پہنچتے ہیں تو بہت شوق سے اس کو دیکھتے ہیں اور جب آیت غضب پر پہنچتے ہیں تو ایسی فکر کی دنیا میں ڈوب جاتے ہیں کہ جیسے دیکھنے والوں کو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دوزخیوں کی آواز کو سن رہے ہیں۔

اے میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! لوگوں میں مسلمانوں کے سب سے زیادہ دشمن یہودی اور مشرکین ہیں اور مومنین سے از روئے محبت سب سے زیادہ نزدیک وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ [1]

اس کے بعد عیسائیوں کے ایک گروہ کی توصیف بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ یہ قرآن کو سنتے ہی ایمان لاتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾

''جب یہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ آیتوں کو سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ حق کے پہچاننے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں پروردگارا ہم ایمان لائے ہمیں بھی اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے گواہوں میں قرار دے''۔ [2]

دوسری جگہ پر جہاں براہ راست مومنین سے خطاب کر رہا ہے، ان لوگوں کا تعارف اس طرح کرا رہا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ

''یعنی خدا نے بہترین کلام کو نازل فرمایا، ایسا کلام جو سراسر ایک ہے اور ایک دوسرے کے مشابہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ صرف

---

[1] س مائدہ، آیت ۸۲

[2] س مائدہ، آیت ۸۳

بشارت نہیں ہے بلکہ نصیحت بھی ہے۔ خدا پرست و خدا ترس لوگ
جب کلمات خدا کو سنتے ہیں تو ان کے جسموں پر کپکپی طاری ہو جاتی
ہے اور ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس وقت ان کی حالت پر
یادخدا سکون اور محبت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے‘‘۔[1]

(جیسے سورہ مریم کی ۵۸ ویں آیت اور سورہ صف کی ابتدائی آیات) اور ان آیات میں اور ان کے علاوہ دوسری آیتوں میں قرآن اس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ یہ محض علمی و تحلیلی کتاب نہیں ہے بلکہ جس طرح یہ منطقی استدلال سے پر ہے، اسی طرح انسان کے احساس و ذوق اور لطائف روح سے بھی پر ہے اور انسان کی روح کو متاثر کرتی ہے۔



---

[1] س زمر، آیت ۲۳

قرآن کے مخاطبین

قرآن کی شناختِ تحلیلی کے سلسلے میں منجملہ دیگر نکات کے ایک اس بات کا بھی استنباط کرنا چاہیے کہ قرآن کے مخاطب کون ہیں، اس بات کی تشخیص و تعین ضروری ہے، مثلاً **ھدیً للمتقین** ''(یہ قرآن) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے''۔ **ھدیً و بشریٰ للمومنین** ''مومنین کے لئے (یہ قرآن) ہدایت و بشارت ہے''۔ **ولینذر من حی** ''(یہ قرآن) زندوں کے ڈرانے کے لئے ہے اوراسی طرح کی بہت سی تعبیرات قرآن نے کی ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت کوئی ضروری چیز نہیں ہے کیونکہ وہ لوگ تو خود ہی پرہیزگار ہیں، دوسری طرف قرآن اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے [۱]

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِيۡنٍ ۝

''یہ قرآن ساری دنیا کے لئے مایہ بیداری ہے اوراس کی خبر تم بعد کو سنو گے''۔ [۲]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب تمام دنیا کے لئے ہے یا صرف مومنین کے

---

[۱] یہ آیت قرآن کی عجیب وغریب آیتوں میں سے ہے۔اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ پیغمبر جس زمانے میں مکے میں رہتے تھے درحقیقت آپ ایک آبادی کے لوگوں سے مخاطب تھے۔لوگوں کے لئے یہ بات بہت ہی تعجب خیزتھی، تنہا ایک آدمی بڑے اطمینان سے کہہ رہا ہے کہ اس آیت کی خبر بہت جلد بعد میں سنو گے کہ یہ کتاب تھوڑی سی مدت کے اندر دنیا والوں کے ساتھ کیا کرے گی؟

[۲] س ص، آیت ۸۷

لئے؟ ایک اور آیت میں قرآن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴿۱۰۷﴾

''اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے تمہیں سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔[1]

اس مطلب کی تفصیل وہاں بیان کی جائے گی جہاں قرآن میں مبحث تاریخ کا ذکر کیا جائے گا۔ یہاں پر اجمالاً عرض ہے کہ جن آیتوں میں قرآن نے دنیا کے تمام لوگوں کو مخاطب کیا ہے وہاں قرآن کا مقصد ہے کہ قرآن کسی قوم یا مخصوص لوگوں کے لئے نہیں بلکہ پوری کائنات کے لئے آیا ہے اور جہاں پر قرآن کو مومنین کے لئے ہدایت کرنے والا یا متقین کے لئے ہدایت کرنے والا کہا گیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ انجام کار وہ کون لوگ ہوں گے جو قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس سے ہدایت حاصل کریں گے اور کون سے وہ لوگ ہوں گے جو قرآن سے دوری اختیار کریں گے۔ قرآن کسی خاص قوم یا معین قبیلہ کو اپنے عقیدت مند و ارادت مند کے عنوان سے ذکر نہیں کرتا۔ قرآن نے یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ وہ، اس قوم یا اس قوم کی ملکیت ہے، دوسرے مکاتب فکر کی طرح قرآن کسی مخصوص طبقہ کے منافع کے لئے نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں صرف فلاں طبقہ کی ضمانت کرتا ہوں مثلاً قرآن یہ نہیں کہتا ہم صرف کاریگروں کی حمایت کرنے آئے ہیں یا ہم تو صرف کسانوں کی پشت پناہی کے لئے ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن اپنی جگہ بطور تاکید کہتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس کا مطلب عدالت کو رواج دینا ہے۔ انبیاء کے بارے میں اعلان کرتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ

''ہم نے انبیاء کے ساتھ کتاب اور ترازو (انصاف کی) اتاری تا کہ

---

[1] س انبیاء، آیت ۱۰۷

وہ لوگوں کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں''۔[1]

قرآن تمام انسانی معاشرے کے لئے عدالت و انصاف چاہتا ہے نہ کہ صرف اس طبقہ یا اس طبقہ اور اس قبیلہ و قوم کے لئے انصاف کا متقاضی ہے۔ نازی ازم کے برخلاف قرآن اپنی طرف تعصب کی بنیاد پر دعوت نہیں دیتا اور نہ ہی مارکسزم کی طرح منفعت طلبی اور نفع پرستی پر بھروسہ کرتا ہے اور نہ لوگوں کو ان کی (دنیاوی) منفعت کی لالچ دے کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔[2]

قرآن جس طرح انسان کے وجدان عقلی کی اصالت کا قائل ہے اسی طرح اس کے لئے ایک فطری و وجدانی اصالت کا بھی قائل ہے اور اسی حق جوئی و عدالت طلبی کی بنیاد پر انسان کو ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔ اسی لئے اسلام کا پیغام نہ تو مزدوروں کے لئے منحصر ہے اور نہ کسانوں کے لئے، قرآن ظالم و مظلوم دونوں کو مخاطب کرتا ہے کہ حق کا راستہ اپناؤ۔

قرآن نے جس طرح حضرت موسیٰؑ کا قصہ نقل کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل اور فرعون دونوں کو خدا کا پیغام دیتے تھے اور دونوں سے چاہتے تھے کہ خدا پر ایمان لائیں اور اس کی راہ پر گامزن رہیں۔ اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واقعہ نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رسالت و دعوت کو جس طرح سرداران قریش کے لئے پیش کیا، اسی طرح ابوذر و عمار کے لئے بھی پیش فرمایا۔ قرآن نے متعدد ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن میں انسان گمراہی کو چھوڑ کر راہ حق پر آ گیا ہے۔ ہاں قرآن نے اس نکتے کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ عیش و نعمت کے گہواروں میں پلنے والوں کا حق کی طرف پلٹنا بہ نسبت غریبوں اور مظلوموں کے بدرجہا مشکل ہے۔ مظلوموں اور غریبوں کا طبقہ اپنی فطرت کی بناء پر عدالت و انصاف کا راستہ اختیار کرتا ہے لیکن ثروت مندوں اور مالداروں کے طبقے کو چونکہ شخصی

---

[1] س حدید، آیت ۲۵

[2] کیونکہ ایسی صورت میں اپنے ماننے والوں کے لئے عدالت وحق کا نظریہ نہیں پیش کر سکتا، بلکہ پھر تو وہ لوگوں کی خواہشات، منافع، ان کو خوش رکھنے کا مقصد پیش نظر رکھے گا۔

منافع اور گروہی منافع کو چھوڑنا پڑتا ہے اس لئے وہ بڑی مشکل سے حق وعدالت کو قبول کرتا ہے۔

قرآن اعلان کرتا ہے کہ ہمارے ماننے والے وہی لوگ ہیں جن کی روح پاکیزہ ہے اور یہ لوگ صرف حقیقت جوئی اور عدالت طلبی کی بناء پر جو ہر انسان کا فطری حق ہے۔قرآن کے گرویدہ ہوجاتے ہیں۔دنیاوی جذبے، مادی خواہشات،طلب منفعت کی خاطر ایسانہیں کرتے۔



فصل دوم

عقل کے بارے میں قرآنی نظریہ

اس سے پہلے ہم قرآن کی زبان کے بارے میں تحریر کر چکے ہیں اور مختصراً عرض کر چکے ہیں کہ قرآن اپنا پیغام پہنچانے کے لئے دو زبانیں استعمال کرتا ہے ایک منطقی استدلال اور ایک احساس کی زبان۔ اور دونوں زبانوں کے مخصوص مخاطب ہیں۔ منطقی استدلال کی مخاطب عقل ہے اور احساس کا مخاطب دل ہے، اس بحث میں عقل کے بارے میں قرآنی نظریے کی تحقیق کریں گے۔

پہلے تو ہم طے کرلیں کہ قرآن کی نظر میں عقل مند ہے بھی کہ نہیں؟ یعنی علمائے فقہ واصول کی زبان میں عقل حجت ہے کہ نہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کی واقعاً کوئی صحیح دریافت ہے تو کیا انسان کو اس کا احترام کرنا چاہیے اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر عمل کیا اور اتفاقاً کسی جگہ پر غلطی ہوگئی تو خدا اس کو معاف کردے گا اور معذور سمجھے گا یا اس پر عقاب (عذاب) کرے گا؟ اور اگر اس کے مطابق عمل نہ کرے تو کیا خدا اس بناء پر کہ اس نے حکمِ عقل کی مخالفت کی ہے اس کو سزا دے گا یا نہیں؟

عقل کی حجیت

اسلامی نظریے کے مطابق عقل کی حجیت کا مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ومسلم ہے اور علمائے اسلام میں سے کسی نے بھی.... سوائے چند لوگوں کے...... عقل کی حجیت میں شک

نہیں کیا اور فقہ کے چاروں ماخذوں .....قرآن، حدیث، عقل، اجماع ......میں سے عقل کو ایک ماخذ تسلیم کیا ہے۔

قرآن کی طرف سے غور وفکر کی دعوت

چونکہ ہم قرآن کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اس لئے عقل کی حجیت بھی قرآن ہی سے ثابت کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن نے مختلف طریقوں سے عقل کی حجیت کو تسلیم کیا ہے۔ ساتھ، ستر مقامات پر جہاں پر عقل کی حجیت کا اشارہ ملتا ہے ان میں سے صرف ایک مورد سے ہی اثبات مطلب کیا جا سکتا ہے بطور مثال صرف ایک مثال ذکر کرتا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ۝۲۲

''زمین پر چلنے والوں میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو گونگے، بہرے اور بے عقل ہیں''[1]

ظاہر ہے کہ یہاں گونگے بہرے سے مراد زبان کے گونگے اور کان کے بہرے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو سننا نہیں چاہتے یا سنتے ہیں تو زبان سے اعتراف نہیں کرتے جو کان حقائق کو سننے سے عاجز ہوں اور صرف خرافات و مہمل چیزوں کو سننے پر آمادہ ہوں وہ قرآن کی نظر میں بہرے ہیں اسی طرح جو زبان حقائق کا اعتراف نہ کرے صرف بکواس ہی بکواس کرتی ہو، وہ قرآن کی نظر میں گونگی ہے، اسی طرح بے عقل وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ایسے لوگ جن کا نام انسانوں میں شمار کرنے

---

[1] س انفال، آیت ۲۲ دابۃ لغت میں جانوروں کے علاوہ حشرات الارض پر بھی بولا جاتا ہے لیکن عربوں کے استعمال میں یہ صرف چار پاؤں والوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، جیسے گدھا، گھوڑا، خچر وغیرہ)

کے لائق نہیں ہے، قرآن نے ان کو حیوانات اور چار پایوں سے تشبیہ دی ہے [۱]

اسی طرح توحید افعالی اور توحید فاعلی کی جگہ پر ایک مسئلہ توحید کے ضمن میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

''کسی شخص کو اذن خدا کے بغیر ایمان لانے کا حق نہیں ہے'' [۲]

ایسے مشکل مسئلہ کے بعد جس کا تحمل نہ ہر ذہن کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکتا ہے اور واقعاً انسان کو جھنجوڑ دینے والا مسئلہ ہے۔ قرآن اس آیت کے بعد کہتا ہے:

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰

''اور بے عقل لوگوں پر گندگی قرار دیتا ہے''۔ [۳]

(ان دونوں سورہ انفال و یونس) آیتوں کو میں نے بطور نمونہ ذکر کیا ہے۔ منطقی اصطلاح میں قرآن لوگوں کو دلالت مطابقی کے ساتھ تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میں بہت سی ایسی آیتیں بھی ہیں جو التزامی دلالت کے ساتھ عقل کی حجیت کو بھی متاثر کرتی ہیں [۴]

دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھیے کہ قرآن ایسی بات کہتا ہے کہ حجیت وعقل کو تسلیم کیے بغیر وہ بات مانی ہی نہیں جا سکتی مثلاً قرآن اپنے مخالف سے عقلی استدلال مانگتا ہے:

---

[۱] سعدی نے ایک شعر میں اس مطلب کو اچھی طرح سے بیان کیا ہے

[۲] س یونس، آیت ۱۰۰

[۳] ایضاً

[۴] اگر ایک چیز سے کوئی دوسری چیز سمجھ میں آئے تو اس کو دلالت کہتے ہیں۔ سمجھانے والی چیز دال اور سمجھی جانے والی مدلول کہلاتی ہے۔ دلالت کی کئی قسموں میں سے ایک دلالت لفظی بھی ہے اور دلالت لفظی کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ دلالت مطابقی: یعنی لفظ اپنے پورے موضوع پر دلالت کرے جیسے موٹر بول کے اس کے تمام اجزاء مراد لینا۔

۲۔ دلالت تضمنی: یعنی لفظ اپنے معنی کے بعض اجزاء پر دلالت کرے مثلاً موٹر یہاں ہے اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کا انجن اس کمرے میں ہے۔

۳۔ دلالت التزامی: لفظ اپنے موضوع لہ کے خارج پر دلالت کرے جیسے حسین d سے مظلومیت، حاتم سے سخاوت، رستم سے شجاعت مراد لی جائے

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ [۱]

یہاں پر دلیل التزامی کے ذریعے قرآن عقل کی حجیت کو بیان کر رہا ہے (کیونکہ اگر عقل کی حجیت کو مانتا تو دلیل نہ طلب کرتا) یا ایک جگہ وحدت واجب الوجوب کو ثابت کرنے کے لئے قیاس منطقی ترتیب دیتا ہے جیسے:

لو كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

''اگر زمین و آسمان میں ایک خدا کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو زمین و آسمان فاسد ہوجاتے''۔[۲]

اس جگہ قرآن ایک قضیہ شرطیہ بیان کرتا ہے۔ مستثنیٰ کیا ہے اور تالی کو نادیدہ طور سے مان لیا ہے۔ قرآن عقل کی ان تمام تاکید کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ بعض ان مذاہب کو باطل قرار دے دے جن کا نظریہ ہے ایمان کا عقل سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مومن ہونے کے لئے فکر کو معطل کرنا اور صرف دل پر بھروسہ کرنا چاہیے تا کہ نور خدا دل میں پیدا ہوجائے۔

نظام علیّت ومعلولیّت

دوسری وہ دلیل جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن عقل کی اصالت کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ مسائل کو علت ومعلول کے ارتباط کی بناء پر بیان کرتا ہے۔ علت ومعلول کا رابطہ اور اصل علیت ہی تو عقلاء کے افکار کی بنیاد ہے اور خود قرآن اس کا احترام کرتا ہے اور اس کو استعمال بھی کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن خدا کی باتوں کا ناقل ہے جو نظام علت ومعلول کا خالق ہے اور ان تمام باتوں کے باوجود اس بات سے کبھی غفلت نہیں برتتا۔ نظام سبب ومسبب کا تذکرہ کرتا ہے اور تمام واقعات وحالات کو اسی نظام سبب ومسبب کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً

---

[۱] س بقرہ، آیت ۱۱۱

[۲] س انبیاء، آیت ۲۲

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ

''خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت نہ بدلیں''۔[1]

اس آیت میں قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں خدا کے ارادہ واختیار کے تابع ہیں لیکن خدا انسان کے اعمال کے برخلاف اس پر کوئی چیز زبردستی نہیں ٹھونسنا چاہتا بلکہ قسمتوں کا بھی ایک نظام ہے۔ خدا کسی بھی معاشرے کی قسمت خود بخود اور بے وجہ کبھی نہیں بدلتا۔ البتہ اگر وہ لوگ ایسی چیزوں میں جوان سے مربوط ہیں جیسے اخلاقیات، اجتماعیات وغیرہ اگر خود اس میں تغیر چاہتے ہیں تو خدا بھی تغیر کر دیتا ہے۔

دوسری طرف قرآن مسلمانوں کو تشویش دلاتا ہے، گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کریں اور ان سے درس عبرت حاصل کریں۔ ظاہر ہے کہ اگر اقوام عالم کی سرگذشت محض اتفاق پر مبنی تھی اور ان کو اس پر مجبور کیا گیا تھا تو ان کے حالات کے مطالعہ اور ان سے نصیحت حاصل کرنے کی ترغیب دینا ہی بے کار بات تھی۔ قرآن اس تاکید سے یہ یاد دلانا چاہتا ہے کہ تمام اقوام کی سرنوشت پر ایک ہی نظام حاکم ہے باین عنوان کہ اگر ایک معاشرے کے حالات دوسرے معاشرے کے حالات کے مشابہ ہوں گے تو دونوں کے حالات ایک ہی جیسے ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا وَبِئۡرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصۡرٍ مَّشِيۡدٍ﴿۴۵﴾ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ۚ

[1] س رعد، آیت ۱۱

''کتنے ایسے شہر و دیار ہیں کہ جن کے رہنے والے جب ظلم وستم میں مشغول تھے ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور تمام شہر بالکل ویران ہو گئے ہیں، سارے کنویں، مضبوط قصر سب کے سب معطل و بے کار ہو گئے کیوں اس زمانے کے لوگ زمین پر گردش نہیں کرتے اور اقوام و ملل کے حالات کا مطالعہ نہیں کرتے اور کیوں ان سے درس عبرت حاصل نہیں کرتے۔ ان تمام مطالب میں نظاموں کے قبول کرنے میں دلالت التزامی کی بناء پر نظام علیت ومعلولیت کی تائید ہوتی ہے اور علیت ومعلولیت کے رابطہ کو قبول کرنے کا مطلب عقل کی حجیت کو تسلیم کرنا ہے''[۱]

فلسفۂ احکام

قرآن کی نظر میں عقل کی حجیت مسلم ہے، اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن نے اپنے تمام احکام وقوانین کا فلسفہ بھی بتا دیا ہے یعنی اگر خدا نے یہ حکم دیا ہے تو اس کی علت یہ ہے علمائے اصول کہتے ہیں کہ احکام کی علت میں مصالح ومفاسد دخیل ہیں مثلاً قرآن ایک جگہ حکم دیتا ہے، نماز پڑھو اور دوسری جگہ اس کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ

''نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے''۔[۲]

یہ نماز کا فلسفہ ہے، یہاں نماز کی روحانیت کا ذکر کرتا ہے کہ انسان کو کتنا بلند کرتی ہے اور اس روحانی بلندی کی وجہ سے انسان فحشاء ومنکرات سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دے کر اس کی بھی علت وفلسفہ بیان کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

---

[۱] س حج، آیات ۴۵ تا ۴۶

[۲] س عنکبوت، آیت ۴۵

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾

''تم لوگوں پر روزہ اسی طرح واجب قرار دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر (اور یہ صرف اس لئے واجب کیا گیا ہے) تا کہ تم لوگ متقی و پرہیزگار بن جاؤ''۔[1]

یہی حالت تمام احکام کے لئے ہے جیسے زکوٰۃ، جہاد وغیرہ کہ سب کے بارے میں انفرادی و اجتماعی اعتبار سے وضاحت کرتا ہے اس طرح قرآن تمام آسمانی احکام کو جن کے نتائج اس دنیا کے بعد ظاہر ہوں گے بیان کرتا ہے اور انسان کو آمادہ کرتا ہے کہ اس کے بارے میں غور کرے تا کہ کنہ حقیقت اس پر واضح ہوجائے اور یہ نہ تصور کرے کہ یہ چیزیں صرف فکر بشر کے ماورائی کی چیزیں ہیں۔

عقل کی غلطیوں کا علاج

قرآن کے نزدیک عقل کی حجیت کی ایک اور دلیل ہے اور دیگر سابق دلیلوں سے واضح تر ہے۔قرآن عقل کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔اگر عقل کی حجیت نہ مانتا تو اس کی غلطیوں کی اصلاح کی کوشش نہ کرتا۔اس مطلب کی وضاحت کے لئے بطور مقدمہ چند امور کا بیان کرنا ضروری ہے۔

انسانی ذہن وفکر بہت سی جگہوں پر غلطی کر جاتا ہے اور یہ بات تقریباً سبھی کے نزدیک مسلم ہے۔یہ اور بات ہے کہ اس قسم کی غلطیاں صرف عقل ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ حواس واحساسات بھی غلطیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔مثلاً قوت باصرہ کے لئے دسیوں غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اسی طرح عقل کا مسئلہ ہے۔اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک استدلال مرتب کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر نتیجہ حاصل کرتا ہے لیکن بعد میں

---

[1] س بقرہ، آیت ۱۸۳

پتہ چلتا ہے کہ میرا استدلال ابتداء ہی سے غلط تھا۔اس لئے یہاں پر فطری طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عقل سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں تو پھر قوت فکر یہ کو معطل کر دینا چاہیے یا ایسے اسباب و وسائل تلاش کرنے چاہئیں جن سے پیدا ہونے والی غلطیوں کا تدارک کیا جا سکے۔سوفسطائی حضرات کا خیال ہے کہ عقل پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ بنیادی طور پر عقل سے استدلال کرنا ہی لغو و بے کار سی بات ہے۔

لیکن اہل فلاسفہ نے ان لوگوں کو دندان شکن جوابات دیئے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ عقل کی طرح دیگر حواس بھی اشتباہ کرتے ہیں لیکن کسی نے بھی حواس کو معطل و بے کار کر دینے کا حکم نہیں دیا ہے، چونکہ عقل کو معطل کر دینا ناممکن سی بات ہے اس لئے مفکرین نے یہ طے کیا کہ اس کا تدارک کیا جائے اور اس کی تحقیق کرتے کرتے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہر استدلال دو چیزوں سے مرکب ہوتا ہے، ایک مادہ دوسرے صورت! مثلاً جیسے ایک مکان بنانے کے لئے اینٹ، گچ، لوہا وغیرہ کا ہونا ضروری ہے (اس کو مادہ کہتے ہیں) اسی طرح مکان کا ایک نقشہ بھی ہوتا ہے (اسی کو صورت کہتے ہیں)۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ مکان ہر اعتبار سے کامل ہو تو اس کے لئے گھر میں استعمال کئے جانے والے سامان (لوہا، اینٹ) کا اچھا ہونا ضروری ہے۔اسی طرح نقشہ کا بھی بے عیب و صحیح ہونا ضروری ہے۔

بالکل اسی طرح اگر آپ استدلال کو صحیح کرنا چاہتے ہیں تو اس کے مادہ اور صورت دونوں کو درست ہونا چاہیے۔ جہاں تک استدلال کی صورت کی صحت کا سوال ہے اس کے لئے ارسطو کی منطق موجود ہے۔منطق کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ وہ استدلال کی صورت کی صحت و عدم صحت کو بتا دے اور ذہن انسانی کی اتنی مدد کر دے کہ وہ استدلال کی صورت میں

غلطی نہ کرے۔[۱]

اصل چیز یہ ہے کہ منطق صرف صورت استدلال کی صحت کی ذمہ دار ہے لیکن ہمارے لئے ضروری ہے مادۂ استدلال بھی صحیح ہو یعنی کوئی ایسی چیز ہو جس کے ذریعے مواد فکری کو بھی تولا جا سکے۔

بیکن اور ڈیکارٹ جیسے فلاسفہ نے بڑی تلاش وکوشش کے بعد مادۂ استدلال کے صحت کے لئے معیار قائم کیا ہے۔ارسطو کی منطق استدلال کی صورت میں صحیح کرتی ہے اور ان لوگوں نے جو معیار بنائے ہیں وہ اگر چہ منطق کی طرح قواعد کلیہ تو نہیں ہیں لیکن بڑی حد تک وہ انسان کی مدد کرتے ہیں اور مادۂ استدلال میں غلطی سے بچاتے ہیں۔

لیکن آپ کو یہ جان کر یقینا تعجب ہوگا کہ استدلال کے مادہ میں غلطی سے بچانے کے لئے قرآن نے بہت سے قاعدے پیش کئے ہیں،اور قرآن کو تمام محققین جیسے ڈیکارٹ وغیرہ پر تقدم فضل اور فضل تقدم حاصل ہے۔

قرآن کی نظر میں غلطیوں کے اسباب

قرآن کی نظر میں غلطیوں کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ انسان گمان کو

---

[۱] دنیائے علم میں جہاں بہت سے اشتباہات ہوتے رہتے ہیں انہی میں سے ایک اشتباہ یہ ہے جو بہت سے لوگوں کے لئے سوٗ تفاہم کا سبب بنا ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ارسطو کی منطق جہاں استدلال کی صورت کی صحت وعدم صحت کی ذمہ دار ہے وہیں مادۂ استدلال کے صحت وعدم صحت کی بھی ذمہ دار ہے لیکن چونکہ منطق کا کام مادۂ استدلال کی صحت وعدم سے متعلق ہی نہیں ہے اور لوگوں نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا لہٰذا حکم لگا دیا کہ منطق بے کار ہے۔اتفاق یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی یہی غلطی بار بار دہرائی جاتی ہے اس کا صریحی مطلب ہے کہ یہ لوگ ارسطو کی منطق کو جانتے ہی نہیں۔اگر ہم مکان ہی والی مثال کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ منطق کی حیثیت صحت استدلال میں ایسی ہی ہے جیسی شاقول کی حیثیت دیوار کے سیدھی ہونے میں ہے جس طرح شاقول کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ بتائے اینٹ ٹھیک ہے کہ نہیں،لوہا صحیح ہے یا نہیں کیونکہ شاقول صرف یہ بتاتا ہے کہ دیوار سیدھی ہے یا ٹیڑھی۔اسی طرح منطق صرف استدلال کی صورت کی صحت وعدم صحت کی ذمہ دار ہے۔مادہ کیسا ہے؟ منطق کا اس سے کوئی ربط نہیں ہے اور اب تو ارسطو کی منطق بعد کے علماء کی وجہ سے بہت ہی مکمل علم ہوگئی ہے۔

یقین کا درجہ دے بیٹھتا ہے۔[۱]

اگر کوئی یہ طے کرلے کہ میں مسائل میں صرف یقین پر عمل کروں گا، گمان کو ہرگز یقین کی جگہ نہ دوں گا تو کبھی غلطی میں نہیں پڑے گا۔[۲]

قرآن نے اس بات کی بہت ہی تاکید کی ہے یہاں تک کہ ایک جگہ پر بطور صراحت کہتا ہے کہ فکر بشر کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ گمان کی پیروی کرتا ہے۔ یا ایک دوسری جگہ پر رسولؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ﴿۱۱۶﴾

''زمین میں زیادہ تر وہ لوگ گمان کی پیروی کرنے والے ہیں، اے رسولؐ! اگر تم نے ان کی پیروی کی تو تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے کیونکہ لوگ گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اندازے کی بات کرتے ہیں یہی وجہ ان کے غلطی کرنے کی ہے''۔[۳]

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ

''جس بات کا علم نہ ہو اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی پیروی نہ کرو''۔ یہ

---

[۱] ڈیکارٹ کا بھی پہلا قاعدہ یہی ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے اس کے بعد جب تک میں کافی تحقیق و تفتیش نہ کرلوں گا کسی بھی بات کو قبول نہیں کروں گا اگر ایک فیصد احتمال بھی خلاف میں ہو تو میں اس سے استفادہ نہیں کروں گا بلکہ اس کو ایک کنارے ڈال دوں گا، یقین کا صحیح مطلب بھی یہی ہے

[۲] اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ظنی اور احتمالی مسائل میں اور جہاں پر یقین کا حاصل کرنا ناممکن ہو وہاں پر اسی ظن و احتمال ہی پر عمل کرنا چاہیے لیکن اس میں بھی ظن کو ظن کی جگہ پر اور احتمال کو احتمال کی جگہ پر استعمال کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ ظن و احتمال کو یقین کی جگہ پر استعمال کیا جائے یہی دوسری بات ہے جس کی وجہ سے انسان غلطی کرتا ہے یعنی ظن کو یقین کا درجہ دے دیتا ہے، قرآن اسی سے منع کرتا ہے۔

[۳] س انعام، آیت ۱۱۶

وہ یاددہانی ہے کہ انسان کی پوری تاریخ میں قرآن نے یاددلا دیا ہے
اورانسان کواس طرح غلطی سے بچانے کی کوشش کی ہے۔[۱]

مادۂ استدلال میں دوسرا غلطی کا سبب خصوصاً اجتماعی مسائل میں اندھی تقلید ہے کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ معاشرے میں جو چیز یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے وہ بھی اس پر یقین کر لیتے ہیں یعنی جو چیز معاشرے میں موردقبول ہو یا گزشتہ سے وہ بات چلی آ رہی ہوتو لوگ صرف اس بناء پر اس کو قبول کر لیتے ہیں کہ یہ تو بزرگوں سے چلی آ رہی ہے۔[۲]

قرآن اعلان کرتا ہے کہ ہر مسئلہ کو عقل کے ترازو پر تولو نہ یہ کہ تمہارے بزرگوں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اسی کو سند مان لو یا اس کا بالکل انکار کر دو۔ بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جو پہلے بھی رائج تھے اوراس وقت بھی غلط تھے لیکن لوگوں نے اس کو قبول کر لیا تھا۔اور بہت سے ایسے صحیح مسائل بھی ہیں کہ جو دوردراز زمانوں میں پیش کئے گئے تھے لیکن لوگوں نے اپنی نادانی کی بناء پر اس کو قبول نہیں کیا اسی لئے قرآنی نظریہ ہے کہ مسائل کو عقل وفکر کے ترازو پر تول کر قبول کرو، اندھی تقلید نہ کرو، قرآن نے ذکر کیا ہے کہ لوگ عقل وفکر پر پرکھنے کے بجائے اپنے آباؤاجداد کی تقلید پر باقی رہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۷۰﴾

''جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے احکام کی پیروی کروتو یہ کہتے ہیں کیا ہم اپنے بزرگوں کی روش کو چھوڑ دیں؟ بھلا بتاؤ اگر تمہارے بزرگ بے شعور تھے، تو ان کی بے شعوری کا بھگتان تم

---

[۱] س اسریٰ، آیت ۳۶

[۲] یہ بات بیکن کی تقریروں میں بھی ہے جہاں پر اندھی تقلید کو اس نے بت اجتماعی یا بت عرفی کہا ہے۔اس کا بھی مطلب یہی اندھی تقلید ہی ہے

کیوں بھٹکتو''؟[۱]

قرآن اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ ایک فکر کی قدامت نہ اس کے غلط ہونے یا کہنہ ہونے کی دلیل ہے اور نہ ہی صحیح ہونے کی ذمہ دار ہے جہاں تک کہنگی کا مسئلہ ہے وہ صرف مادی امور تک محدود ہے لیکن حقائق ہستی پر چاہے جتنا زمانہ گزر جائے وہ کہنہ وفرسودہ نہیں ہوا کرتے۔مثلاً:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

''یہ ایک حقیقت ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہنے والی ہے''۔

قرآن کہتا ہے عقل وفکر کے اسلحہ سے مسائل کا مقابلہ کرو۔کسی صحیح عقیدہ کو اس لئے ترک نہ کرو کہ دوسرے لوگ اس کو مانتے ہیں۔اسی طرح کسی عقیدہ کو صرف اس لئے تسلیم نہ کرو کہ کسی بزرگ ومعروف شخص نے اس عقیدہ کو قبول کیا ہے بلکہ ہر مسئلہ کو خود تحقیق و جستجو کے بعد قبول کرو۔[۲]

تیسری چیز جس کی وجہ سے آدمی غلطی کرتا ہے وہ خواہشات نفس کی پیروی کسی غرض ومرض کی بناء پر کوئی اقدام کرنا ہے اس سے بھی آدمی غلطی کا شکار ہوجاتا ہے۔قرآن نے اس بات کی بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے۔

بقول مولوی

چون غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوی دیدہ شد

کوئی بھی مسئلہ ہو جب تک انسان اپنے کو شراغراض سے الگ نہ کرلے گا اس وقت تک صحیح فکر نہیں کرسکے گا۔یعنی عقل اسی وقت صحیح کام کرتی ہے جب خواہشات نفس کی اسیر نہ ہو۔علامہ حلیؒ کا ایک واقعہ ہے جو اس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔وہ یہ ہے کہ علامہ

---

[۱] س بقرہ،آیت ۱۷۰

[۲] اپنے بزرگوں کی اندھی تقلید یا معاشرہ کے رنگ میں رنگ جانے کی قرآن نے شدت سے مخالفت کی ہے لیکن مسائل فقہ میں ایک مجتہد اعلم وعادل کی تقلید واجب ہے۔دونوں میں اشتباہ نہیں ہونا چاہیے۔

حلیؒ کے سامنے ایک مسئلہ پیش ہوا کہ اگر کنویں میں کوئی جانور مر جائے اور ایسے اسباب پیدا ہو جائیں جس کی بناء پر اس کا مردہ جسم کنویں ہی میں رہ جائے تو کنویں کے پانی کا کیا کیا جائے؟ اتفاق سے اسی وقت علامہ حلیؒ کے گھر میں جو کنواں تھا اس میں ایک جانور گر گیا، اب علامہؒ کے لئے مجبوری تھی کہ اپنے لئے بھی استنباط حکم کریں۔ اب یہاں پر دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو کنویں کو بالکل پاٹ دیا جائے اور دوسرے کنویں سے پانی نکالا جائے اور یا اسی کنویں کچھ مقدار پانی کی نکال دی جائے اور باقی پانی کو استعمال کیا جائے۔ علامہ حلیؒ نے سوچا اس مسئلہ میں بدون غرض حکم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ علامہؒ کے کنویں کا بھی مسئلہ تھا اس لئے انہوں نے حکم دیا کہ کنویں کو پاٹ دیا جائے اور پھر اس کے بعد خود بغیر خواہش نفسانی کے استنباط حکم کے لئے بیٹھے۔ قرآن نے خود بھی خواہشات نفس کی پیروی سے بہت زیادہ مقامات پر روکا ہے۔ ہم یہاں پر صرف ایک مقام کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَہۡوَی الۡاَنۡفُسُ ۚ

''وہ لوگ گمان باطل اور خواہشات نفس کے علاوہ کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے۔[1]



[1] س نجم، آیت ۲۳

فصل سوم

دل کے بارے میں قرآنی نظریہ

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عرفانی اور ادبی اصطلاح میں دل سے مراد وہ گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے جو بدن کے بائیں طرف ہوتا ہے اور جو ایک ہینڈ پمپ کی طرح خون کو رگوں میں پھینکتا رہتا ہے مثلاً قرآن نے ایک جگہ کہا ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ [1]

یا جیسا کہ حافظ نے کہا ہے:

''دلم رمیدہ شد و غافلم من درویش''	کہ ایں شکاری سر گشتہ را چہ آمد پیش۔

اس میں دل یا قلب سے مراد ایک ممتاز و بلند حقیقت مراد ہے جو سینے میں بائیں طرف دھڑکنے والے گوشت کے لوتھڑے سے بالکل یہ الگ ہے۔ اسی طرح جہاں پر قرآن دل کی بیماریوں کا ذکر کرتا ہے:

فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ

''ان کے دل مریض ہیں خدا ان کے مرض کو اور زیادہ کرے''۔ [2]

اس سے مراد وہ دل نہیں ہے کہ جس کا علاج ڈاکٹر کرتا ہے اور اگر کوئی ڈاکٹر اس قسم کی بیماریوں کا علاج کرسکتا ہے تو وہ روحانی امراض کا ماہر ہوگا۔

---

[1] س ق، آیت ٣٧

[2] س بقرہ، آیت ٩

دل کی تعریف

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل سے آخر کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب کو وجود انسان کی حقیقت میں تلاش کرنا چاہیے۔ انسان ایک ہونے کے باوجود سینکڑوں اور ہزاروں بعد کا حامل ہے۔ لفظ ''میں'' ہزاروں امیدوں، فکروں، آرزوؤں، عشقوں اور ہزاروں خوف، ڈر .... کا مجموعہ ہے اور یہ سب نہروں اور نالیوں کی طرح ایک مرکز میں مل جاتے ہیں اور یہ مرکز اتنا گہرا اور عمیق سمندر ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے کا ابھی تک کسی نے دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اہل فلسفہ، عرفاء، علماء، روحانی حضرات نے اپنے اپنے امکان بھر اس کی گہرائی سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر ایک صرف محدود حد تک اس کے راز ہائے سربستہ سے پردہ اٹھا پایا ہے۔ ہاں عرفاء شاید دوسروں سے زیادہ اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ قرآن جس چیز کو ''دل'' کہتا ہے وہ خود اس سمندر کی واقفیت ہے کہ ہم جس کو روح ظاہر کہتے ہیں وہ سب ایک ایسے نالے ہیں جو اس سمندر سے جا ملتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ خود عقل بھی ایک ایسی نہر ہے جس کا سلسلہ اسی سمندر سے جا ملتا ہے۔

قرآن جب وحی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو عقل کا دور دور بھی کہیں ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا تمام تر دارومدار قلب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نہ تو عقل کی طاقت اور نہ عقلاء کے استدلال سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا ہے بلکہ یہ صرف قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ایک ایسی حالت میں (جو حالت ہمارے لئے قابل تصور نہیں ہے) پہنچ گیا جہاں پر ان بلند و برتر حقائق کے ادراک و شہود کی استعداد اس میں پیدا ہوگئی۔ سورہ

نجم اور سورہ تکویر کی آیتیں اس ارتباط کی کیفیت کو ایک حد تک بیان کرتی ہیں۔ [۱]

قرآن جہاں پر وحی کے بارے میں باتیں کرتا ہے اور جہاں پر قلب سے گفتگو کرتا ہے وہاں اس کا بیان طائرِ عقل وفکر کی پرواز سے بھی اونچا ہوتا ہے۔لیکن عقل وفکر کے مخالف بھی نہیں ہوتا۔اس جگہ پر قرآن ایک ایسی بینش کو بیان کرتا ہے جو عقل واحساس سے بالاتر ہے اور عقل کی وہاں تک رسائی نہیں ہے، عقل اس کے ادراک سے عاجز ہے۔

قلب کی خصوصیات

قرآن کی نظر میں ''قلب'' ایک پہچان کا آلہ بھی ہے۔ بنیادی طور سے قرآن کے پیغام کا بہترین مخاطب انسان کا دل ہے۔ایسا پیغام جسے صرف دل کے کان ہی سن سکتے ہیں کوئی دوسرا کان اس کے سننے پر قادر نہیں ہے، اسی لئے قرآن اس آلہ کی حفاظت و

---

[۱] سورہ النجم، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ ''رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کہتے''، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ ''وہ صرف وہی کہتے ہیں جو وحی ہوتی ہے''، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ''اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک طاقت ذات (خدا) نے تعلیم دی''، ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ ''وہی مقتدر ملک جو اپنی کامل صورت پر جلوہ گر ہوا اور آنحالیکہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمال کے افق اعلیٰ پر فائز تھا''۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ ''پھر نزدیک آیا اور اس پر نازل ہوا'' فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹ ''دو کمانوں یا اس سے بھی زیادہ نزدیک ہوا''، فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝۱۰ ''اپنے بندہ کو جو وحی کرنی تھی کر دی، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝۱۱ ''دل نے جو بھی دیکھا ٹھیک دیکھا''۔قرآن ان تمام باتوں کو اس لئے کہہ رہا ہے تاکہ یہ بتادے کہ ان مسائل کی سطح حیطۂ عقل سے باہر ہے یہاں دیکھنے اور بلندی حاصل کرنے کی گفتگو ہے اور سورہ تکویر میں ارشاد ہے: یہ قرآن رسولؐ کا کلام نہیں ہے بلکہ خدا نے اپنے کلام کو ایسے فرشتے کے ذریعے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر القاء کیا ہے جو بہت طاقتور ہے اور خدا کا امین ہے۔تم لوگ چونکہ ان کے کلام کو اپنے عقل پر منطبق نہیں پاتے ہو اس لئے ان کو دیوانہ خیال کرتے ہو، یہ غلطی ہے، وہ دیوانے نہیں ہیں، انہوں نے اس طاقتور فرشتے کو افق میں آشکار دیکھا، یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ بھی غیب کا مشاہدہ کرتا ہے اپنے تک محدود نہیں رکھتا اور دوسروں سے بخل نہیں کرتا۔علامہ اقبال نے اس جگہ فرمایا ہے: ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ شخص ہے جو حقائق سے لبریز وسرشار ہوتا ہے پھر زمانے کو سامان دینے کے لئے اور مسیر تاریخ کو بدلنے کے لئے جو کچھ اس تک پہنچا ہے بیان کرتا ہے''

نگہداری اور تکامل میں بہت تاکید کرتا ہے۔قرآن کے اندر تزکیہ نفس، روشنی دل، صفائے قلب کے مسائل جا بجا بکھرے پڑے ہیں، ملاحظہ فرمایئے،

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۙ﴿۹﴾

''جس نے اپنے دل کو آلودگیوں سے محفوظ رکھا وہ نجات پا گیا''۔[۱]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

كَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱﴾

''نہیں نہیں بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو اعمال (بد) کرتے ہیں (اس کی وجہ سے) ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے''۔[۲]

روشنی قلب کے لئے ارشاد ہے

اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّـكُمۡ فُرۡقَانًا

''اگر تم نے تقویٰ و پاکیزگی کے راستہ کو اختیار کیا تو خدا تمہارے دلوں کو روشن کردے گا''[۳]

ایک اور جگہ ہے:

وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ

''جو لوگ ہماری راہ میں خلوص نیت سے کوشش کرینگے ہم اپنے راستہ کی طرف ان کی ہدایت کرینگے''۔[۴]

چونکہ کارہائے ناشائستہ انسان کی روح کو تاریک و گندا کردیتے ہیں اور کشش و پاکیزگی کو اس سے سلب کرلیتے ہیں اس لئے قرآن نے متعدد جگہوں پر اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[۱] س شمس، آیت ۹
[۲] مطففین، آیت ۱۴
[۳] انفال، آیت ۲۹
[۴] عنکبوت، آیت ۶۹

مومنین کی زبان سے کہلایا جارہا ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا

''خداوند ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد کج نہ ہونے دے''۔ [۱]

بدکاروں کی صفت بیان کرتا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ①

''نہیں نہیں بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو اعمال (بد) کرتے ہیں (اس کی وجہ سے) ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے''۔ [۲]

دوسری جگہ اس طرح ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ

''جب ان لوگوں نے حق سے اپنا چہرہ موڑ لیا تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو حق کی طرف متوجہ ہونے سے موڑ دیا'' [۳]

اور کہیں پر اس طرح تعبیر کی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہے، ان کے دلوں پر قفل لگا ہوا ہے، ان کے دل سخت ہو گئے ہیں:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ

''خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں'' [۴]

۔ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

---

[۱] ال عمران، آیت ۸
[۲] مطففین، آیت ۱۴
[۳] صف، آیت ۵
[۴] بقرہ، آیت ۷

اِلَيۡكَ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ

''ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے تا کہ وہ نہ سمجھ سکیں''۔[1]

ایک اور جگہ پر ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴿۱۰۱﴾

''اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر کر دے گا''۔[2]

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ﴿۱۶﴾

''ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور انہی میں سے اکثر لوگ فاسق و بدکار ہیں''۔[3]

ان تمام تاکیدوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن انسان کے لئے ایک بلند معنوی اور روحانی فضا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہر ہر فرد اس فضا کو سالم رکھے اور چونکہ ایک اجتماعی ناسازگار اور غیر صحیح فضا میں پاک وصاف رہنا عموماً ممکن نہیں ہوتا اس لئے قرآن اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ ہر شخص کو ایک ایسے اجتماعی ماحول کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر دینی چاہئیں جس میں تزکیہ نفس ہو سکے۔

قرآن صریحی طور پر اس بات کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام عشاق و ایمان، بلند قدریں، نصائح وغیرہ سب کا مقصد یہی ہے کہ انسان اور انسانی معاشرہ تمام رذالتوں، پستیوں، خواہشات نفس کی پیروی، شہوت رانی سے دور ہی رہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی حکام وقت پورے معاشرے کو اپنے کنٹرول میں کرنا چاہتے ہیں اور اس سے غلط استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسی چیز تلاش کریں جس سے روح معاشرہ کثیف ہو سکے اور اس مقصد کے

---

[1] انعام، آیت ۲۵

[2] اعراف، آیت، ۱۰

[3] حدید، آیت ۱۶

حصول کے لئے لوگوں میں بدکاریوں کا رواج دیتے ہیں اور لوگوں کو شہوت رانی کی ترغیب دیتے ہیں اس کا سب سے زیادہ تکلیف دہ نمونہ سپین کے مسلمانوں میں ملتا ہے کہ ....سپین اس زمانے میں مغربی دنیا کے اندر سب سے زیادہ متمدن شمار ہوتا تھا اور انقلاب صنعتی کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور بڑی اہمیت کا حامل تھا...........عیسائیوں نے سپین کو مسلمانوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے نوجوانوں کے اخلاق و روحانیت کو فاسد کرنے کی کوشش شروع کردی اور رفتہ رفتہ لہوولعب، شہوت پرستی مسلمانوں میں رائج کرنے لگے اور وہ لوگ اپنے اس پلان میں اتنا کامیاب ہوئے کہ سرداران فوج، سربراہان مملکت کو بھی اس جال میں پھانس لیا اور اس طرح مسلمانوں کے ارادے، عزائم، شجاعت، ایمان اور پاکیزگی روح کا جنازہ نکال دیا اور مسلمان بدتر سے بدتر، کمزور، عیاش، شراب خور، عورت پرست ہوتے گئے۔

اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو مغلوب کر لینا بہت آسان ہے اور پھر عیسائیوں نے مسلمانوں کی تین سوسال سے لے کر چار سوسال تک کی حکومت سے ایسا انتقام لیا کہ تاریخ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے شرماتی ہے۔جن عیسائیوں کو حضرت عیسیٰؑ نے یہ تعلیم دی تھی کہ اگر تمہارے ایک رخسار پر کوئی طمانچہ ماردے تو دوسرا رخسار خود پیش کردو۔انہوں نے اندلس........... سپین........... کے بے گناہ مسلمانوں کے خون کا دریا بہادیا اور چنگیز کے چہرے کو سفید کردیا لیکن ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ذلت آمیز شکست خود ان کی پست ہمتی، فساد روحی اور قرآنی دستور پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ تھی۔

ہمارے زمانے میں بھی استعمار نے جہاں جہاں قدم جمائے ہیں اسی حربے کو استعمال کیا ہے جس سے قرآن نے مسلمانوں کو بہت پہلے ہوشیار کردیا تھا، استعمار کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دلوں کو فاسد کردے اور جب دل فاسد ہوجاتے ہیں تو عقل کسی کام کی نہیں رہتی بلکہ انسان کے ہاتھ پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ استعمار مدارس کے کھولنے، یونیورسٹیوں کے قائم کرنے کی ممانعت نہیں کرتا بلکہ خود بھی مدارس کے لئے

بھرپور کوشش کرتا ہے اور تعاون کرتا ہے لیکن دوسرے راستے سے اپنی پوری طاقت اس بات پر لگاتا ہے کہ اساتذہ وطلاب کے قلوب وارواح فاسد ہوجائیں ۔ یہ لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ بیمار کا دل اور اس کی روح کسی کام کے قابل نہیں رہ جاتے بلکہ ان کو ہر ذلت وپستی کی طرف کھینچا جاسکتا ہے۔

لیکن قرآن کا پورا زور معاشرے کی روح کو پاکیزہ بنانے پر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ

''نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ و برائی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو''[1]

یعنی نیک کام فرداً فرداً نہیں بلکہ سب لوگ مل جل کر انجام دو۔

دل کے سلسلے میں دو تین نکتے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین f کے واسطہ سے آپ حضرات کے لئے نقل کرتا ہوں تا کہ اس بحث کا خاتمہ بالخیر ہو، سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے: ایک دن ایک شخص رسول خداؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا میں کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں اجازت ہو تو عرض کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے سوالوں کے جوابات سننا پسند کرو گے یا سوالات کو دہرانا بھی چاہتے ہو؟ اس نے کہا میں جواب سننا چاہتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے بر و نیکی اور گناہ و برائی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو! اس نے کہا جی ہاں میں یہی چاہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تین انگلیوں کو اکٹھا کر کے آہستہ آہستہ سے اس کے سینے پر مار کر فرمایا: یہ بات تو تم اپنے دل سے پوچھ لو، اس کے بعد فرمایا انسان کا دل اس طرح بنایا گیا ہے جس میں نیکی کا پیوند لگا ہوا ہے، نیکی سے اس کو سکون ملتا ہے لیکن برائی سے پریشان اور مضطرب ہوجاتا ہے۔ جیسے انسان کا بدن ہے اگر کوئی ایسی چیز جو اس سے موافقت نہ رکھتی ہو، اس پر واقع ہو تو پورے

---

[1] مائدہ، آیت ۲

نظام کوخراب کر دیتی ہے، یہی نہیں نا شائستہ افعال کے ذریعے روح انسان بھی اختلال سے دو چار ہوجاتی ہے۔ ہمارے یہاں جو بولا جاتا ہے کہ فلاں چیز عذاب روح کا سبب بن گئی ہے وہ یہی برائی و بداعمالی ہے۔ استفت قلبک وان افتاک المفتون۔ یعنی ''حقیقت امر کو اپنے دل سے پوچھ لو (وہ صحیح خبر دے گا)''۔ مفتی حضرات چاہے جو بھی کہتے رہیں، مولانا روم نے اسی بات کو اپنی مثنوی میں کہا ہے:

پس پیمبر گفت استفت القلوب   اگرچہ مفتشان برون گوید خطوب

اسی طرح ایک اور شعر میں ہے:

گوش کن استفت قلبک از رسول   گرچہ مفتیٔ برون گوید فضول

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی حساس نکتہ کو بیان فرماتے ہیں کہ اگر انسان واقعی حقیقت کو تلاش کرنے والا ہوتو انکشاف حقیقت کے لئے اپنے کو بیگانہ بنالے ایسی صورت میں اس کا دل ہرگز خیانت نہیں کرے گا بلکہ اس کی صحیح رہنمائی کرے گا۔ یہ بات صحیح ہے کہ جب تک انسان حق وحقیقت کا جوئیدہ ہوتا ہے اور راہ حق میں قدم اٹھاتا ہے تو جو بھی اس کو ملے وہ حق وحقیقت ہی ہوتا ہے۔

ہاں ایک بات ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر لوگ دھوکے میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ انسان اسی وقت گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے جب شروع ہی سے کسی خاص جہت کو نظر میں نہیں رکھتا اور ابتدا ہی سے خالص حقیقت کا متلاشی نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ''برّ'' کے بارے میں پوچھا یہ کیا ہے؟ تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تم واقعی برّ کو تلاش کر رہے ہو تو جس کام سے تمہارے دل کو آرام ملے اور تمہارا وجدان آسودہ ہوجائے وہی برّ ہے لیکن اگر تم کسی چیز کی طرف راغب تو ہو لیکن تمہارے دل کو اس سے سکون وآرام نہیں ملتا تو سمجھ لو کہ وہ برّ نہیں، اثم ہے۔

ایک اور جگہ پر لوگوں نے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمان کے معنی پوچھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی ایسا ہے کہ برا کام کر کے نادم و پشیمان اور ناراحت

ہوتا ہے اور اچھا کام کر کے خوش وخرم ہوتا ہے تو اس کے پاس ایمان ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

مومن جب تعلقات دنیا کی گرفتاری [1] سے آزاد ہوتا ہے تو اپنے دل میں دوستئ خدا کی مٹھاس وشیرینی کو محسوس کرتا ہے اور اس وقت اس کو زمین تنگ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس عالم مادہ سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ اولیاء خدا اور مردانِ خدا نے اپنی زندگی میں اس کو صحیح پایا ہے۔

سیرت رسول ﷺ میں تحریر ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نماز صبح کے بعد اصحاب صفہ.......... یہ وہ حضرات تھے جو فقیر تھے، مال دنیا سے ان کے پاس کچھ نہ تھا، مدینے میں مسجد رسول ﷺ کے بغل میں زندگی بسر کرتے تھے.......... کی تلاش میں نکلے۔ آپ کی نظر زید یا حارث بن زید پر پڑی دیکھا کہ بہت ہی کمزور اور رنجیدہ ہے، آنکھیں اندر گھس گئی ہیں پوچھا کیسے ہو؟ عرض کیا میں نے ایسی حالت میں صبح کی ہے کہ اہل یقین سے ہو گیا ہوں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم نے بہت بڑا دعویٰ کیا ہے، ذرا بتاؤ تو اس کی علامت کیا ہے! اس نے جواب دیا میرے یقین کی علامت یہ ہے کہ راتوں کی نینداڑ گئی ہے۔ دن کو روزہ رکھتا ہوں، رات کو صبح تک عبادت کرتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ کافی نہیں ہے اور بتاؤ؟ پھر اس نے جب بیان کرنا شروع کیا تو کہتے کہتے کہنے لگا خدا کے رسول ﷺ! میں اس وقت ایسی حالت میں ہوں کہ اہل جنت واہل دوزخ کو گویا دیکھ رہا ہوں، ان کی آوازیں سن رہا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو آپ ﷺ کے ہر صحابی کے باطن کی خبر بتانا شروع کر دوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بس بس اب زیادہ نہ کہو، اچھا یہ بتاؤ کیا آرزو رکھتے ہو؟ کہا راہِ خدا میں جہاد!

قرآن کہتا ہے: دل کو جلا دینے سے انسان اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں

---

[1] میں نے اپنی کتاب ''سیری در نہج البلاغۃ'' میں وضاحت سے بتایا ہے کہ اسلام دنیا سے علاقہ رکھنے اور دنیا سے وابستگی پیدا کرنے میں فرق کا قائل ہے: مولف

حضرت علیؑ نے فرمایا تھا: اگر میرے سامنے سے پردہ ہٹا بھی دیا جائے تو میرے یقین میں اضافہ ممکن نہیں ہے۔ قرآن کا مطمح نظر ایسے انسانوں کی تربیت کرنا ہے جو علم و عقل کے اسلحہ سے لیس ہوں اور قلب و دل کے ہتھیاروں کو راہ خدا میں استعمال کرنے والے ہوں اور اگر ایسے افراد دیکھنا ہوں جو اس کی زندہ مثال ہوں تو ہمارے آئمہ f اور ان کے سچے اصحاب کو دیکھو۔

والسلام علیکم
ورحمۃ اللہ وبرکاتہ